حکومت بہار
اردو ڈائرکٹوریٹ
بہار، پٹنہ

سلسلہ نمبر۔۱۴

بیتاب صدیقی

ڈاکٹر نسیم اختر

Monograph-14

Betab Siddiqui

By : Dr. Nasim Akhtar

بیتاب صدیقی کا پورا نام مولانا عبدالحئی بیتاب صدیقی شمسی تھا۔ وہ ایک بڑے اردو تحریک کار، اچھے صحافی، خوش فکر شاعر، معتبر ادیب، مجاہد آزادی اور اردو و فارسی کے لائق و فائق استاذ تھے۔ پٹنہ کے رام موہن رائے سمینری (ہائی اسکول) میں انھوں نے اردو زبان و ادب کے نہایت کامیاب اور مقبول استاذ کی حیثیت سے بڑی شناخت حاصل کی۔ ان کے شاگردوں میں پروفیسر احسان اشرف، سابق مرکزی وزیر طارق انور، مشہور صحافی ریاض عظیم آبادی اور معروف شاعر شان الرحمن وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

مولانا بیتاب صدیقی کی شخصیت کے کئی روشن پہلو ہیں۔ جن میں سب سے روشن اور مثالی پہلو اردو اور بہار کی اردو تحریک سے ان کی جنون کی حد تک محبت ہے۔ ان کی پوری زندگی اردو کی دیوانہ وار خدمت سے عبارت رہی۔ وہ اردو کے فروغ اور ترویج کے لئے ساری زندگی جنون کی حد تک سرگرم عمل رہے۔ بہار میں اردو تحریک کے سالار غلام سرور اور عبدالمغنی رہے۔ لیکن سچائی یہ بھی ہے کہ اس تحریک کی جڑ میں مولانا بیتاب صدیقی کا کردار بنیادی اور اصل رہا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اگر بیتاب صدیقی نہ ہوتے تو یہ تحریک اتنی منظم اور موثر نہ ہوتی اور اردو کو ثانوی سرکاری زبان کا درجہ حاصل کرنے میں مزید وقت لگ سکتا تھا۔ بہار میں اردو تحریک کی تاریخ بیتاب صدیقی کے ذکر کے بغیر ادھوری اور نامعتبر رہے گی۔

مولانا بیتاب صدیقی کے تحریکی اور سیاسی رفقا میں غلام سرور، سردار لطیف الرحمن، محمد ایوب ایڈووکیٹ، شاہ مشتاق احمد، سہیل عظیم آبادی، عبدالمغنی، تقی رحیم، رامائن سنگھ، کے۔ کے۔ پودار، پروفیسر عبدالباری، عبدالقیوم انصاری، شری کرشن سنہا، کیدار پانڈے، کرپوری ٹھاکر اور عبدالغفور وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

بیتاب صدیقی ایک مجاہد آزادی بھی تھے۔ ان کا تعلق ایک ایسے سخت گیر محب وطن (نیشنلسٹ) خانوادے سے تھا جو ملک کی آزادی تک انگریزی حکومت سے مسلسل برسر پیکار رہا۔ انھوں نے 1942ء کی مشہور زمانہ تحریک ''انگریزوں بھارت چھوڑو'' میں سرگرم حصہ لیا اور اسیر زنداں بھی ہوئے۔

بیتاب احمد صدیقی نے ہفتہ وار ''مومن دنیا'' اور ''طوفان'' جیسے اخبار کے توسط سے اپنی صحافتی زندگی شروع کی اور ایک صحافی کی حیثیت سے انھوں نے اپنی ایک الگ پہچان بنائی۔ وہ غلام سرور کے روزنامہ ''سنگم'' سے بھی وابستہ رہے اور اپنا صحافتی جوہر دکھاتے رہے۔ انھوں نے کئی درسی کتابیں بھی تدوین کیں۔ جسے بہار ٹکسٹ بک پبلشنگ کارپوریشن پٹنہ نے شائع کیا۔ ان کی ایک اہم تحقیقی اور تاریخی کتاب سرکردہ مجاہد آزادی اور عظیم کانگریسی رہنما شاہ زبیر احمد کی سوانح حیات پر مشتمل ہے۔

بیتاب صدیقی کی طویل اور اعلیٰ خدماتِ اردو اور ملک کے لئے ان کی قربانیوں کے پیش نظر حکومت بہار نے ان کو کئی اہم عہدوں پر فائز کیا ہے۔ وہ بہار اسکول اکزامنیشن بورڈ کے رکن، بہار اسٹیٹ سنی وقف بورڈ کے صدر نشیں، مذہبی ولسانی اقلیتی کمیشن بہار کے سکریٹری، بہار اردو اکادمی کی مجلس عاملہ کے رکن اور بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے رکن بنائے گئے اور وہ اپنی خصوصی دلچسپی اور بہتر کارکردگی کے ذریعہ ان اداروں کو مستفید کرتے رہے۔

اس فردنامے کے مصنف ڈاکٹر نسیم اختر ایک معتبر محقق، اچھے صحافی، صاحب نظر مبصر اور ناقد ہونے کے ساتھ ایک اردو تحریک کار بھی ہیں۔ سالارِ اردو غلام سرور کے ساتھ وہ تین دہائیوں تک اردو تحریک اور ان کے انقلابی اخبار ''سنگم'' سے وابستہ رہے۔ اردو تحریک اور سنگم کے توسط سے نسیم اختر کا بیتاب صدیقی سے بھی طویل عرصے تک گہرا رشتہ اور تعلق رہا۔ وہ ان کی شخصیت اور زندگی کے نشیب و فراز سے واقف رہے۔ لہٰذا اس فردنامے کی تصنیف کا حق وہی بہتر انداز پر ادا کر سکتے تھے۔ ان کا یہ فردنامہ سندِ اعتبار کا حامل ہے۔ اردو ڈائرکٹوریٹ کی مولانا بیتاب صدیقی جیسی جلیل القدر شخصیت پر یہ پیش کش اولین اور لائق تحسین ہے۔

—اسلم جاوداں

प्रकाशक
उर्दू निदेशालय
मंत्रिमंडल सचिवालय विभाग, बिहार, पटना

معمارِ دبستانِ بہار

فرد نامہ

بیتاب صدیقی

ڈاکٹر نسیم اختر

طابع وناشر:
اردو ڈائرکٹوریٹ
محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار، پٹنہ

© جملہ حقوق بحق اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار محفوظ

سلسلہ نمبر۔۱۴

Betaab Siddiqui

By

Dr. Nasim Akhtar

نام کتاب	بیتاب صدیقی
مصنف	ڈاکٹر نسیم اختر
سال اشاعت	2022ء
کل صفحات	128
کمپوزنگ وتزئین	محمد سعید احمد
سرورق	امجد حسین ڈیزائن سنٹر، پٹنہ
طابع	نیو فائن آرٹ آفسیٹ، درگاہ روڈ، پٹنہ۔٦

ملنے کا پتہ
اردو ڈائرکٹوریٹ، سی. بلاک، 111، آفیسرس فلیٹ، بیلی روڈ، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۱
فون نمبر : 0612-2530093، ای میل : directorurdu@gmail.com

فہرست

پیش لفظ	احمد محمود	4
ابتدائیہ	ڈاکٹر نسیم اختر	6
بیتاب صدیقی: ایک نظر میں	—	9
شخصی تعارف: خاندانی پس منظر	—	13
بیتاب صدیقی: مختصر حالات زندگی	—	19
بیتاب صدیقی: ایک مجاہد آزادی	—	36
بیتاب صدیقی اور اردو تحریک	—	43
بیتاب صدیقی اور غلام سرور	—	62
بیتاب صدیقی: ایک سخنور	—	71
بیتاب صدیقی: صحافتی خدمات	—	80
بیتاب صدیقی: ادبی خدمات	—	91
گیسوئے اردو ابھی...	—	104
بیتاب صدیقی: ایک اجمالی جائزہ	—	126
حوالے	—	128

پیش لفظ

دبستان لکھنو، دبستان دہلی اور دبستان دکن کی طرح اپنے مخصوص اور بیش قیمت شعری و ادبی روایت اور سرمائے کی بنیاد پر دبستان بہار بھی ایک اہمیت کا حامل ہے۔

سرزمین بہار میں شعر و ادب کی یکتائے زمانہ اور باکمال شخصیتیں ہر دور میں ظہور پذیر ہوتی رہی ہیں اور اپنے کمالِ فن سے دنیائے ادب میں بہار کا نام روشن کرتی رہی ہیں۔

شاد عظیم آبادی، امداد امام اثر، شوق نیموی، فضلِ حق آزاد، بیدل عظیم آبادی، انجم مانپوری، اختر اورینوی، جمیل مظہری، سہیل عظیم آبادی، کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود، کلیم عاجز، مظہر امام، عبدالصمد، شوکت حیات، احمد یوسف اور شفیع مشہدی جیسی بے مثل اور یکتائے زمانہ ادبی شخصیتوں نے پوری ادبی دنیا میں بہار کی شعری و ادبی عظمت و اہمیت کا پرچم لہرایا اور دبستان بہار کو مضبوط شناخت عطا کی۔ دبستان بہار کی شعری و ادبی روایت اس قدر مقتدر اور وقیع ہے کہ دنیائے ادب اسے بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتی ہے اور ان کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے۔

اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ دبستان بہار کی جملہ سرکردہ اور مقتدر ادبی شخصیتوں کی وقیع خدمات شعر و ادب کا اعتراف کرتا ہے۔ ان کے ادبی سرمایہ کو محفوظ رکھنے اور اسے نئی نسل تک پہنچانا اپنا نصب العین سمجھتا ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر اردو ڈائرکٹوریٹ نے گزشتہ دنوں دس مشاہیر ادب بہار ۱۔ شاد عظیم آبادی، ۲۔ پرویز شاہدی، ۳۔ کلیم الدین احمد، ۴۔ رضا نقوی واہی، ۵۔ علامہ واقف عظیم آبادی، ۶۔ عبدالمغنی، ۷۔ وہاب اشرفی، ۸۔ رمز عظیم آبادی، ۹۔ شین مظفر پوری، ۱۰۔ کلیم عاجز کے فردنامے (مونوگراف) شائع کرائے۔ ان فردناموں کا ادبی دنیا میں زبردست استقبال کیا گیا اور اردو ڈائرکٹوریٹ کی اس پیش کش کو اہم اور قیمتی قرار دیا گیا نیز مزید مشاہیر دبستان بہار پر فردنامے کی اشاعت کا مطالبہ بھی کیا گیا ہے۔

اردو ڈائرکٹوریٹ نے دانشوران شعر و ادب کی ایک اہم مشاورتی نشست میں مشوروں کے بعد اتفاق رائے سے مزید ۳۲ فردناموں کی اشاعت کا فیصلہ لیا۔ جن گراں قدر ادبی شخصیتوں پر فردناموں

کی اشاعت کا فیصلہ لیا گیا ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

۱۔ امداد امام آثر، ۲۔ فضل حق آزاد عظیم آبادی، ۳۔ شوق نیموی، ۴۔ انجم مانپوری، ۵۔ یاس یگانہ چنگیزی، ۶۔ بیدل عظیم آبادی، ۷۔ قاضی عبدالودود، ۸۔ جمیل مظہری، ۹۔ اختر اورینوی، ۱۰۔ سہیل عظیم آبادی، ۱۱۔ شکیلہ اختر، ۱۲۔ حسن نعیم، ۱۳۔ غیاث احمد گدی، ۱۴۔ کلام حیدری، ۱۵۔ احمد یوسف، ۱۶۔ صدیق مجیبی، ۱۷۔ احمد جمال پاشا، ۱۸۔ اویس احمد دوراں، ۱۹۔ لطف الرحمٰن، ۲۰۔ اسرار جامعی، ۲۱۔ جمیلہ خدابخش، ۲۲۔ رشیدۃ النساء، ۲۳۔ بیتاب صدیقی، ۲۴۔ قمر اعظم ہاشمی، ۲۵۔ راسخ عظیم آبادی، ۲۶۔ عبدالغفور شہباز، ۲۷۔ پیغام آفاقی، ۲۸۔ غلام سرور، ۲۹۔ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی، ۳۰۔ مظہر امام، ۳۱۔ اجتبیٰ رضوی، ۳۲۔ کیف عظیم آبادی۔

مولانا بیتاب صدیقی اردو تحریک اور اردو زبان وادب کی ایک مستند اور ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے۔ امتداد زمانہ نے بہت کم عرصے میں ان کی جامع کمالات شخصیت کے نقوش کو دھندلا کر دیا، لیکن اردو ڈائرکٹوریٹ نے ان کی اہمیت اور خدمات زبان وادب کے پیش نظر فرد نامہ نگاری کے لئے ان کے نام کا بھی انتخاب کیا۔

ڈاکٹر نسیم اختر اردو کے ایک معتبر محقق اور ادیب ہیں۔ بہار کی اردو تحریک سے وابستہ ہونے کے سبب مولانا بیتاب صدیقی سے ان کا براہِ راست گہرا تعلق رہا ہے۔ ان کا یہ فرد نامہ مولانا موصوف کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات کا مکمل اور کامیاب احاطہ کرتا ہے۔

اردو ڈائرکٹوریٹ مولانا بیتاب صدیقی جیسی اہم ادبی، لسانی اور تحریکی شخصیت پر فرد نامہ کی شکل میں اُن کا اوّلین شخصی وادبی تعارف پیش کر رہا ہے۔

امید ہے کہ آپ کو اردو ڈائرکٹوریٹ کی یہ پیش کش پسند آئے گی۔

احمد محمود

ڈائرکٹر، اردو ڈائرکٹوریٹ

محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، پٹنہ

ابتدائیہ

مولانا عبدالحئ بیتاب صدیقی شمسی بہار میں اردو تحریک کے ایسے ہی ایک جانباز سپاہی تھے جن کی ساری زندگی اردو تحریک سے عبارت تھی۔ اپنی طالب علمی کے دور میں وہ ایک زبردست مجاہد آزادی بھی تھے اور 1942ء کے بھارت چھوڑو آندولن میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد ملک گیر سطح پر اردو کے تحفظ وبقا، درس وتدریس اور ادب وصحافت کی خدمت کرتے ہوئے اپنے جسم وجاں کی دولت لٹاتے رہے۔ اگرچہ ان کی خدمات آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق تھیں، لیکن مجھے نہیں معلوم کہ گزشتہ پچیس برسوں میں ان پر ایک بھی مضمون شائع ہوا ہو۔ اپنے اسلاف کے کارناموں سے بے توجہی ہماری بے حسی اور مجرمانہ غفلت کا نتیجہ ہے۔

اکتوبر 1996ء میں غلام سرور نے اپنے یہاں ایک رات کھانے پر چند لوگوں کو مدعو کیا۔ جس میں خرابی صحت کے باوجود بیتاب صدیقی بھی شریک ہوئے۔ اس یادگاری عشائیہ پر غلام سرور نے راقم کے ذمے یہ کام سپرد کیا کہ کسی طرح بیتاب صدیقی کی شخصیت اور کارناموں سے متعلق معلومات فراہم کر کے روزنامہ 'سنگم' پٹنہ کے حوالے کرتا جاؤں۔ اس موقع پر انہوں نے یہ تاکیدی جملہ بھی دہرایا کہ:

''کس کا چل چلاؤ کس وقت ہو جائے، نہیں معلوم، پہلے ہم جائیں یا مولانا جائیں، لیکن مولانا پکے ہوئے آم ہیں، اب ٹپکے اور تب ٹپکے۔''

یہ کام نہایت مشکل اور صبر آزما تھا۔ ان دنوں بیتاب صدیقی کی صحت بہت خراب جا رہی تھی۔ وہ تمام رات تنفس اور کھانسی کے عارضے میں بستر پر کروٹیں بدلتے رہتے اور دن میں آرتھرائٹس ان کی جان نکالتا۔ میں نے ہمت نہ ہاری، ان کے پیچھے لگ گیا اور ان کے حافظے کے اوراق کو الٹتا رہا۔ جیسے جیسے وہ اپنی زندگی سے متعلق انکشاف کرتے گئے میرے ساتوں طبق روشن ہوتے رہے۔ بچپن سے ضعیفی تک کی ایک عجیب وغریب داستان تھی!! ایک ایسی کہانی جسے ہمیں ضرور جاننا اور پڑھنا چاہیے۔

29 ستمبر 1996ء سے روزنامہ 'سنگم'، پٹنہ کے اداراتی صفحہ پر میرے مضمون 'حیاتِ بیتاب' کی قسط وار اشاعت کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ ابھی کوئی سولہ سترہ قسط ہی منظر عام پر آئی تھی کہ غلام سرور کا خدشہ سچ ثابت ہوا۔ پہلے بیتاب صدیقی اللہ کو پیارے ہو گئے چند برسوں بعد غلام سرور بھی اپنے دیرینہ رفیق سے جا ملے۔

آج جب کہ دنیا لاک ڈاؤن کے دور سے گزر رہی ہے، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ کے اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر جناب احمد محمود نے مجھے بیتاب صدیقی پر ایک 'فردنامہ' لکھنے کی سعادت بخشی، اس قفل بندی میں فردنامے کے عنوان نے میرے ذہن کے بند دریچوں کو کھول دیا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ہم نے بیتاب صدیقی کو بھلا دیا، ان کے غیر معمولی کارناموں کو فراموش کر بیٹھے۔ نہ اردو کی کسی مجلس میں ان کا ذکر نہ کسی رسالے میں تذکرہ۔

بیتاب صدیقی پر یہ کتاب خشت اوّل کی حیثیت رکھتی ہے، لہٰذا اس کی فروگزاشت کو اسی انداز میں دیکھنے کی کوشش کی جانی چاہیے، البتہ مجھے اس موضوع پر اپنے بعد کی نسل سے بہتر توقعات وابستہ ہیں۔

اس فردنامے میں ہر باب کے ساتھ متعلقہ موضوع سے متعلق نمونے ساتھ ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ مثلاً سخنوری میں بیتاب صدیقی کا شعری کلام، ادبی خدمات میں چند ادبی مضامین اور صحافت میں ان کے اداریوں کے نمونے ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں تاکہ فردنامے کے مطالعے کے بعد ایک مجموعی اور جامع تصور قارئین کے سامنے آسکے۔

اردو ڈائرکٹوریٹ کے پروگرام آفیسر ڈاکٹر اسلم جاوداں کے پیہم اصرار اور ناصحانہ مگر مخلصانہ مشورہ "نسیم صاحب! ہم لوگوں کے پاس وقت بہت کم ہے، کچھ کر جائیے، جو وقت میسّر ہے وہ دوبارہ نہیں آئے گا" سماجی فاصلے کے اس تکلیف دہ دور میں ان کا مشورہ بیتاب صدیقی سے مزید قربت کا سبب ہوا، جس کے نتیجے میں اس فردنامے کی تکمیل ممکن ہوسکی۔ اسلم جاوداں کی اس اخلاقی حمایت کے لیے میں تہہ دل سے مشکور ہوں۔

ان نامساعد حالات میں اسم بامسمّٰی پروفیسر محسن رضا رضوی (صدر شعبہ اردو، اورینٹل کالج، پٹنہ سٹی) نے اس کام کو انجام تک پہنچانے میں میری بھرپور معاونت فرمائی۔ ضروری صلاح ومشورے دیے اور اپنی مصروفیات کے باوجود مسودے پر ایک نظر ڈالنے کی زحمت کی۔ میں ان کے احسانات سے دست بردار نہیں ہوسکتا۔

لاک ڈاؤن کے ضابطوں کی مکمل پیروی کرتے ہوئے مسیح الرحمٰن قاسمی (استاد الحراء پبلک اسکول، شریف کالونی، پٹنہ) جو کمپوزنگ کا بھی اچھی استطاعت رکھتے ہیں نے پورے مسودے کی کمپوزنگ یوں کی کہ میں اپنے گھر سے موبائل پر بولتا گیا اور وہ مجھ سے بہت دور رہ کر اس کی کمپوزنگ کرتے رہے۔ اسی اسکول کے ایک کہنہ مشق استاد حامد حسین ندوی نے پروف کی خواندگی کر کے میرے کام کو آسان کیا۔ میں ان دونوں کا بیحد شکرگزار ہوں۔

۵/جولائی ۲۰۲۰ء

نسیم اختر

فردنامہ : بیتاب صدیقی

بیتاب صدیقی: ایک نظر میں

- نام : عبدالحئی
- تخلص : بیتاب
- قلمی نام : بیتاب صدیقی
- والد : عبدالمجید (مرحوم)
- والدہ : بی بی حفیظ النساء (مرحومہ)
- پیدائش : 1916ء
- وطن : ڈمری کٹسری (موجودہ ضلع شیوہر)
- وطن ثانی : پٹنہ
- رسم مکتب : 1923ء
- زیر اہتمام : حضرت مولانا سید بدرالدین، امیر شریعت، امارت شرعیہ بہار واڑیسہ
- ابتدائی تعلیم : (۱) دادی اور پھوپھی کے زیر نگرانی
  (۲) مقامی مکتب میں داخلہ
  (۳) مدرسہ جامع العلوم، مظفرپور
  (۴) فوقانیہ: مدرسہ عزیزیہ، بہار شریف
- اعلیٰ تعلیم : 1940-1945 مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ
- سن فراغت : 1945ء فاضل (گولڈ مڈلسٹ)
- ادبی وسیاسی سرگرمیاں : (۱) 'بزم اردو' اور 'اردو سکھاؤ مہم' کی بنیاد
  (۲) 1936ء رکن مسلم ماس کونٹیکٹ کمپین، (کانگریس کی قائم کردہ کمیٹی
  (۳) 1940-45ء سکریٹری: جامعۃ الطالبات، مدرسہ

اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ
(۴) خلافت تحریک میں سرگرم
(۵) 1942ء بھارت چھوڑو آندولن میں شمولیت اردو تحریک سے وابستگی: 1951ء بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے قیام سے تادم مرگ۔

- صدر جمہوریہ ہند سے ملاقات: 24رفروری 1956ء: بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام بہار میں اردو کو اس کے اپنے رسم الخط کے ساتھ سات مخصوص مقاصد کے استعمال کے لیے ایک وفد کی شکل میں صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد سے ملاقات کر کے سوا نو لاکھ ہندو، مسلم، سکھ کے دستخطوں کے بنڈل پر مشتمل ایک عرضداشت کی پیشی۔
- لسانی سروے : 1968ء کے لسانی سروے کے لیے دستخطی مہم میں تحریکی رفقا کے ساتھ تقریباً پورے بہار کے گاؤں گاؤں، شہر شہر کا دورہ، انجمن کے جنرل سکریٹری کے عہدے پر رہتے ہوئے اردو دوستوں کو بیدار کرنے کے لیے خود ہزارہا خطوط لکھے اور بڑی مشقتیں اٹھائیں۔ لگاتار لکھنے کی وجہ سے ان کی گردن میں سروائیکل اسپانڈیلائٹس کا مرض ہوگیا جس نے بعد میں بڑی بھاری بیماری کی شکل اختیار کر لی اور دو ماہ پی ایم سی ایچ میں زیر علاج رہے۔
- ازدواجی زندگی کا آغاز : 1949ء
- اہلیہ : پھول باندی بیگم
- اولاد : تین لڑکیاں اور ایک لڑکا
- ملازمت : (۱) ابتدائی چند برسوں تک مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں معلم۔
  (۲) 1948ء رام موہن رائے سیمنری پٹنہ میں اردو اور فارسی کے استاذ کی حیثیت سے تقرر۔
- سبکدوشی : 1985ء مزید دو سال کے لیے ملازمت میں توسیع۔
- قید زنداں : (۱) آزادی سے قبل ایک بار
  (۲) آزادی کے بعد دو بار

(۳) 1965ء میں غلام سرور کے ساتھ DIR کے تحت گرفتار

- ابتدائے سخنوری : 10 سال کی عمر سے
- پہلا شعر : لالہ کی طرح دل جو مرا داغدار ہے
کیا پہلوئے رقیب میں وہ گل عذار ہے
- آخری غزل : 1995ء (اب تک کی تحقیق کے مطابق)
- مطلع : درد و غم کا زمانہ مسکن ہے
زیست ناکامیوں کا مدفن ہے
- ترک سخنوری : 1959ء ریاستی انجمن ترقی اردو بہار کے جمشید پور اردو کنونشن کے انعقاد کے بعد صرف اردو تحریک کے لیے وقف
- ادبی زندگی کا آغاز : زمانہ طالب علمی سے
- صحافت : (۱) 1947ء ایڈیٹر ہفتہ وار 'مومن دنیا'، پٹنہ
(۲) 1950ء ایڈیٹر ہفتہ وار 'طوفان'، پٹنہ
(۳) 1953ء ہفتہ وار سنگم، پٹنہ کے اجرا کے ساتھ ساتھ اس کے غیر اعلانیہ ایڈیٹر۔
- انتظامی عہدے : (۱) 1974-78ء رکن بہار سکنڈری اسکول اکزامینیشن بورڈ
(۲) 1977-79ء چیئرمین، بہار اسٹیٹ سنی وقف بورڈ
(۳) 1972-77 سکریٹری، مذہبی لسانی اقلیتی کمیشن، بہار
(۴) 1977-81ء رکن مجلس عاملہ بہار اردو اکادمی
(۵) 15 برسوں تک رکن، بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ
- مقصد حیات : اردو کے لیے جینا، اردو کے لیے مرنا۔
- خاندانی پس منظر : بیتاب صدیقی کے خاندان کا شمار اپنے عہد کے انتہائی متمول اور معزز گھرانوں میں ہوتا ہے۔ اس خانوادے کی سب سے اہم خصوصیت یہ رہی کہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی پہلی دستک سے لے کر صبح آزادی تک نسلاً بعد نسلٍ سات پشت انگریزوں سے برسرپیکار رہا۔ اسی کے ساتھ انہوں نے اپنے علاقے اور اس سے باہر سماجی، سیاسی و

اصلاحی سطح پر غیر معمولی خدمات انجام دیں نیز ڈُمری کٹسری، ضلع شیوہر میں جنگلوں کو صاف کرا کے بستی پر بستیاں آباد کیں۔

- حلقہ سیاست : ڈاکٹر سید محمد محمود، پروفیسر عبدالباری، جے پرکاش نارائن، عبدالقیوم انصاری، شاہ محمد زبیر، شری کرشن سنہا، بینودانند جھا، کیدار پانڈے، مہامایا پرساد، انوگرہ نارائن سنہا، کرپوری ٹھاکر، عبدالغفور وغیرہ
- حلقہ رفاقت : سردار محمد لطیف الرحمٰن، محمد ایوب ایڈووکیٹ، غلام سرور، لیڈی انیس امام، لیڈی نعیمہ حیدر، لیڈی عزیزہ امام، شاہ مشتاق احمد، سہیل عظیم آبادی، پروفیسر عبدالمغنی، رضی احمد، کامریڈ حبیب الرحمٰن، تقی رحیم، کے کے پودار، رامائن سنگھ، کیپٹن پروفیسر شرف عالم، سید شہباز حسین وغیرہ
- تحریر و تصنیف : اردو کی ہمہ جہت ترقی سے متعلق مضامین، تحریکی لٹریچر اور نصابی و حوالہ جاتی کتابوں کی تصنیف و ترتیب
- اہم تصنیف : معمارِ قوم – شاہ محمد زبیر 1990ء
- آخری احتجاجی دھرنا : دسمبر 1995ء بوٹ کلب دہلی، زیر اہتمام بہار ریاستی انجمن ترقی اردو، غلام سرور اور انجمن کے دیگر رفقاء کے ساتھ۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کو بہار میں لانے کے لیے۔
- انتقال : 07 دسمبر 1998ء
- مدفن : شاہ گنج قبرستان، مہندرو، پٹنہ

❋

بیتاب صدیقی: خاندانی پس منظر

عبدالحئی بیتاب صدیقی، ولد عبدالمجید ولد عبدالغنی ولد جعفر حسین، ولد طیب اللہ، ولد گوہر علی، ولد نعمت اللہ، ولد خضر حسین ان سات پشتوں کے علاوہ باقی کا ٹھیک ٹھیک شجرہ نہیں ملتا ہے۔ خضر حسین اس سلسلے کی آخری کڑی ہیں۔ قیاس اغلب ہے کہ ان کا دور سولھویں صدی نصف سے سترہویں صدی کے آغاز کا رہا ہوگا۔ اکبر کے عہد سلطنت (1556-1605ء) میں وہ عرب اور ایران سے ہوتے ہوئے ہندوستان وارد ہوئے۔ اس زمانے میں حاجی پور ایک پرگنہ تھا جہاں وہ عامل کے منصب پر فائز تھے۔ اکبر کے عہد میں یہ عہدہ تحصیلدار (ریونیو کلکٹر) کا ہوتا تھا، جو حکومت کو محصول کی فراہمی میں کلیدی حیثیت رکھتا تھا۔ خضر حسین نے اپنی ملازمت کی سہولت کے اعتبار سے اسی پرگنہ کی ایک بستی شنکر سرائے میں اپنے خاندان سمیت بود و باش اختیار کرلی تھی۔ اس دوران ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا اثر ورسوخ شروع ہو چکا تھا۔ کمپنی نے یہاں کے پونجی پتیوں اور کاروباری حلقوں کو اعتماد میں لے کر مسلمانوں اور ان کی حکومت کے خلاف سیاسی واقتصادی سطح پر معاندانہ محاذ قائم کر رکھا تھا۔ اس سازش کو روکنے اور ناکام کرنے میں جو لوگ پیش پیش تھے ان میں خضر حسین اور ان کا خانوادہ بھی تھا لیکن رفتہ رفتہ مغلیہ سلطنت کمزور پڑتی گئی اور سرکار بہادر کا رعب ودبدبہ اور اثر ورسوخ روز افزوں بڑھتا گیا۔ نتیجتاً دیسی ساہوکاروں کی مدد سے برطانوی سامراجیت زندگی کے تقریباً تمام شعبوں پر قابض ودخیل ہوتی گئی یہاں تک کہ مغلوں کو اقتدار سے بے دخل کردیا۔ اسی دوران علی وردی خان (1740-56ء) نے محسوس کیا کہ انگریز ملک کے سیاسی ومعاشی محاذ پر اپنی گرفت مضبوط کرتے جارہے ہیں چنانچہ انہوں نے بڑی حکمت عملی سے ملکی ساہوکاروں اور کمپنی کا باہم مقابلہ شروع کیا۔ جس میں خضر حسین کے پوتے گوہر علی اور اس خاندان کے دوسرے اعزہ بھی علی وردی خاں کے ساتھ تھے مگر آپسی اختلافات اور سامراجی پالیسیوں کے سامنے یہ لوگ کمپنی کا مقابلہ نہیں کرسکے، یہاں تک کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقبال کا پرچم ہر طرف لہرانے لگا۔ ان حالات سے دل برداشتہ خضر حسین

اپنے خاندان سمیت نقل مکانی پر مجبور ہوئے اور حاجی پور سے مٹھیا (مغربی چمپارن کی ایک بستی جو بگہا بلاک میں ہے) چلے آئے۔ اگرچہ انہوں نے یہاں کافی زمین وجائداد حاصل کی مگر علاقے کے مسلمانوں کی پسماندگی، جہالت اور توہم پرستی سے بہت پریشان ہوئے۔ اس لیے انہوں نے بستی کے لوگوں میں سوجھ بوجھ اور بیداری پیدا کرنے کی بڑی کوششیں کیں مگر جب کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا تو وہاں سے مظفر پور کے قریب واقع ڈومری بستی کے میر غیاث الدین چک (عرف مرغیا چک) چلے آئے۔ اس وقت یہ پورا علاقہ جنگل سے بھرا تھا جسے انہوں نے صاف کراکر بستیاں آباد کیں اور خود بھی یہیں سکونت پذیر ہوگئے۔

بیتاب صدیقی کے بزرگوں میں خضر حسین، گوہر علی، نعمت اللہ ان کے بیٹے طیب اللہ وغیرہ بڑے انگریز مخالف اور کٹر نیشنلسٹ تھے۔ انہوں نے اپنے علاقے سے باہر کے بااثر برادر وطن کو اعتماد میں لے کر حکومت برطانیہ کے خلاف محاذ آرائی شروع کردی۔ جس میں غازی پور، کٹسری اور بھلواہی (موجودہ ضلع سیتامڑھی) کے لوگوں نے بھی ان کا بھرپور تعاون کیا، لیکن جب برطانوی سامراج کی بڑھتی ہوئی طاقت کے سامنے انہیں کوئی بڑی کامیابی نہیں ملی تو ان کے خلاف گوریلا وار چھیڑ دیا۔ چنانچہ جب اور جہاں موقع ملتا انگریزوں کے مفاد کو نقصان پہنچاتے رہے۔

بیتاب صدیقی کی آبائی بستی ڈمری کٹسری، 'قاضی ٹولہ'، جو سات قصبوں پر مشتمل تھی، سے متصل ایک 'میر ٹولہ' تھا جہاں ذی وقار اور ذی حیثیت میر خاندان کا دور دورہ تھا۔ دونوں ٹولوں میں بیتاب صدیقی کی برادریاں قائم تھیں۔ ان میں ایک جید عالم دین مولانا سید وصی الدین گزرے ہیں جو مدرسہ عالیہ کلکتہ (قدیم نام محمڈن کالج کلکتہ، سال قیام 1780ء) میں پرنسپل کے عہدے پر فائز تھے۔ وہ انگریزوں کے بڑے منظور نظر تھے۔ خلافت تحریک کے خلاف فتویٰ دینے کے عوض حکومت نے انہیں 'شمس العلماء' کے خطاب سے نوازا۔ بیتاب صدیقی کے جدامجد جعفر حسین کے پانچ بیٹے تھے ان میں سب سے بڑے عبدالغنی، بیتاب صدیقی کے دادا تھے۔

عبداللطیف کی انگریز دشمنی:

بیتاب صدیقی کے چھوٹے دادا عبداللطیف کی شجاعت وبہادری پورے علاقے میں مشہور تھی۔ ان کی انگریز دشمنی کا چرچا بھی عام تھا۔ وہ اپنے علاقے سے کسی انگریز کو گزرتے ہوئے دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ یہی ذہنیت اس بستی میں تقریباً زیادہ تر لوگوں کی تھی کیوں کہ بستی اور اطراف میں رہنے والے

انگریزوں سے ان کی ہمیشہ دشمنی رہتی تھی۔ایک بار کا واقعہ ہے کہ ایک انگریز جوڑا اپنے گھوڑے پر سوار وہاں پہنچا۔بستی کے کچھ لوگوں اور انگریز جوڑے سے کسی معاملے کو لے کر بحث شروع ہوگئی۔بات کافی آگے بڑھتی گئی یہاں تک کہ وہ ہندوستانیوں کو سخت وسست کہنے لگا۔عبداللطیف سے برداشت نہیں ہوا، مارے غصے کے انہوں نے انگریزی جوڑے پر لاٹھی سے ایسا وار کیا کہ وہ اپنی بیوی سمیت گھوڑے سے گر پڑا، بیوی کی اسی جگہ موت واقع ہوگئی، دو تین دنوں بعد انگریز بھی چوٹ کی تاب نہ لاکر چل بسا۔اس ہلاکت کی خبر بستی سے باہر تک جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔اگرچہ وہ لوگ عبداللطیف کی بہادری پر خوش تھے مگر انگریزوں کی طرف سے ممکنہ انتقامی کارروائی سے ڈرے ہوئے بھی تھے۔عبداللطیف صورتحال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے وہاں سے کلکتہ بھاگ گئے۔ادھر انگریز حکام ان کے گھر اور علاقے کی تلاشی لیتے رہے۔البتہ انگریزوں کی طرف سے بعد میں پھر کوئی ردّعمل نہیں ہوا۔عبداللطیف کلکتہ میں بے یارومددگار پڑے رہے۔جو پیسہ گھر سے لے کر بھاگے تھے وہ بھی ختم ہورہا تھا۔اسی دوران انہیں معلوم ہوا کہ وہاں سے ہندوستانی مزدوروں کا ایک قافلہ جہاز سے افریقہ جارہا ہے۔چنانچہ وہ مزدوروں کے ساتھ افریقہ کے کسی نامعلوم علاقے میں جا پہنچے۔وہاں کی زبان، رہن سہن سب سے وہ ناآشنا تھے۔کسی طرح ان مزدوروں کے ساتھ چند ماہ گزرے تھے کہ انہیں پتہ چلا کہ وہاں سے کوئی جہاز امریکہ جانے والا ہے۔کلکتہ کی طرح افریقہ میں بھی انہوں نے اپنے پرانے تجربے کو دہرایا اور وہ سان فرانسسکو جا پہنچے۔وہاں بندرگاہ پر بڑی تعداد میں ہندوستانی مزدور کام کرتے تھے، عبداللطیف انہیں مزدوروں کے درمیان ایسا گھل مل گئے کہ نہ انہیں وہاں کوئی روکنے والا تھا نہ ٹوکنے والا۔انہوں نے مزدوری کرتے ہوئے کافی سرمایہ حاصل کیا۔اس کے علاوہ ٹھیکیداروں کے درمیان بھی اچھا خاصا رسوخ قائم کرلیا۔کچھ دنوں بعد انہوں نے وہیں ایک ہندوستانی لڑکی سے شادی کرکے اپنی ازدواجی زندگی کی شروعات کی۔

بقول بیتاب صدیقی، کبھی کبھی ان کا خط آبائی وطن ڈمری آجاتا۔آخری خط 1902ء کے کسی ماہ میں آیا تھا جس میں انہوں نے اپنے عزیزوں کو تمام صورتحال سے آگاہ کرتے ہوئے واپس واطن لوٹنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور یہ بھی لکھا تھا کہ وہ سان فرانسسکو میں ہیں، کافی بوڑھے ہوگئے ہیں اور خاصی دولت کے مالک بھی ہیں۔وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح ہندوستان واپس آجائیں اور اہل خاندان ان کی دولت سے استفادہ کرسکیں۔لیکن خاندان والوں کی تنگ نظری اور عصبیت ان کی واپسی کی راہ میں حائل ہوئی۔ان لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ کرسچن ہوگئے ہوں گے۔اس لیے ان کی واپسی سے خاندان کا نظام تباہ و برباد ہوجائے

گا۔غرض وہ امریکہ میں ہی رہے اس کے بعد سے پھر ان کی کوئی خبر نہ ملی۔

دادا :

بیتاب صدیقی کے دادا عبدالغنی ان کے دادا بھائی عبدالرحیم، عبدالصمد، عبدالواحد وغیرہ ڈمری بستی کے ہی باشندہ تھے اور ان کا شمار علاقے کے بڑے متمول زمینداروں میں ہوتا تھا۔اپنی خوشحالی، سماجی منصب اور معاملہ فہمی کی وجہ سے بستی سے باہر بھی وہ ادب واحترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔انگریز مخالف ہونے کے سبب مقامی انگریز کوٹھی والوں اور انگریز حامی راجہ شیوہر سے آئے دن حجت وتکرار ہوتی رہتی تھی۔آپس میں مقدمہ بازی کا سلسلہ بھی تھا۔ایسٹ انڈیا کمپنی کا جو نمائندہ پرسونی کوٹھی، شیوہر میں رہتا تھا اس سے بھی محاذ آرائیوں کا سلسلہ جاری تھا کیوں کہ وہ انگریز نواز تھا۔چنانچہ عبدالغنی کی دولت کا ایک بڑا حصہ انہیں مقدمات کی پیروی میں جاتا رہا۔انہوں نے اپنے علاقے میں جہالت دور کرنے کے لیے کئی مکتب اور اسکول بھی قائم کیے۔اگرچہ اس زمانے میں غیرمسلم بچے بھی مدرسہ کے مولویوں سے اردو اور فارسی پڑھتے تھے مگر عبدالغنی نے ان کی سہولت کے لیے پاٹھ شالے بھی کھلوائے تاکہ علاقے میں تعلیم کا چلن عام ہو۔انہوں نے اپنی بستی میں ایک مسجد بھی تعمیر کرائی تھی۔

عبدالغنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان آپسی خیرسگالی کی فضا کو پروان چڑھانے میں ہمیشہ کوشاں رہے۔اس اعتبار سے بھی وہ اپنے علاقے میں مقبول اور ہردلعزیز تھے۔وہ خلافت تحریک میں بھی بہت فعال تھے۔جس کی وجہ سے بہت مصروف رہتے تھے۔ملک کی ممتاز مذہبی وسیاسی شخصیتیں جب شمالی بہار کے دورہ پر آتیں تو عموماً ان کا قیام عبدالغنی کے یہاں ہی ہوتا تھا۔مولانا محمد شوکت علی اور مولانا محمد علی انہیں کی دعوت پر 22-1921ء میں ان کے مہمان ہوئے۔علی برادران کی آمد کے موقع پر علاقہ میں اور اس سے باہر بڑے بڑے جلسہ واجتماع کا اہتمام انہوں نے ہی کیا تھا۔انہیں کی کوششوں سے مظفرپور اور موتیہاری کی ممتاز شخصیتوں کے ساتھ ایک بڑی تعداد میں لوگ خلافت تحریک میں شامل ہوگئے تھے۔بقول **بیتاب صدیقی:**

> ''ان کے بچپن میں جب علی برادران اس علاقہ کے دورہ پر آئے اور ان کے دادا کے مہمان ہوئے اس وقت وہ بستی کے ایک مکتب میں پڑھتے تھے۔شوکت علی سے دعا لینے کے لیے انہیں بلایا گیا تو انہوں نے ان سے کچھ سنانے کو کہا جس پر بیتاب صدیقی نے برجستہ یہ اشعار پڑھے:

یا الٰہی کب مری افسردہ حالی جائے گی
ہند سے کب قوم نصرانی نکالی جائے گی
یا الٰہی بھیج دے مہدی و عیسیٰ جلد تو
یہ بلا کالی گھٹا کب سر سے ٹالی جائے گی

یہ سن کر دونوں برادران بہت خوش ہوئے اور انہیں اپنے سینے سے لگاتے ہوئے دعائیں دیں اور کہا کہ یہ بچہ بڑا ہو کر اپنا نام روشن کرے گا۔''

عبدالغنی کی مصروفیات کی وجہ سے گھریلو معاملات و دیگر ذمہ داریوں کی انجام دہی کے لیے انہیں بالکل وقت نہیں ملتا تھا جس سے خاندان میں لامرکزیت قائم ہوگئی تھی، چنانچہ بیتاب صدیقی کی دادی اور ان کے والد نے کاشتکاری کے معاملات کو کسی حد تک اپنے قابو میں کر رکھا تھا جس سے گھر کے تمام اخراجات پورے ہوتے تھے۔ زندگی کے آخری دور میں انہیں مالی دشواریاں بھی پیش آئیں اس لیے زمینداری کا کچھ حصہ انہوں نے فروخت کر دیا لیکن کاشتکاری کو انہوں نے بہت فروغ دیا۔ اگر چہ بیتاب صدیقی کی دادی بی بی رضیہ خاتون ایک مذہبی، دیندار اور خالص گھریلو خاتون تھیں اس کے باوجود خاندان کا تقریباً سارا نظم و نسق اور کاشتکاری کے انتظام و انصرام میں ان کا عمل دخل تھا۔ یہاں تک کہ شوہر کے انتقال کے بعد زمیندارانہ امور اور ان سے وابستہ عملوں کی نگرانی اور ان کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے وہ قرب و جوار کے کھیت کھلیان میں بھی جایا کرتی تھیں۔

عبدالغنی تقریباً 84 سال کی عمر میں 34-1933ء کے آس پاس وفات پا گئے۔ ان کی وصیت کے مطابق گاؤں کی مسجد سے متصل زمین خرید کر ان کی تدفین عمل میں آئی۔ آج بھی اس جگہ ان کی کچی قبر نمایاں مقام پر موجود ہے۔ ان کی رحلت کے بعد اہلیہ بھی تقریباً پچاسی سال کی عمر میں انتقال کر گئیں۔ اسی کے ساتھ خاندان کی تمام تر ذمہ داریاں بیتاب صدیقی کے والد عبدالمجید کو منتقل ہو گئیں۔

والد:

بیتاب صدیقی کے والد عبدالمجید نے انیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں اپنے آبائی وطن ڈمری ٹولہ (موجودہ شیوہر ضلع) کے ایک متمول گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ وہ ایک گھریلو تعلیم یافتہ مگر انتہائی باصلاحیت اور دانشور تھے۔ مختلف علوم و فنون کے علاوہ کئی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ وہ بہت

اچھے گھوڑ سوار اور عمدہ نسلوں کے گھوڑے پالنے کے بے حد شوقین تھے۔ اسی شوق نے انہیں گھوڑوں و دیگر مویشیوں کا معالج بھی بنا دیا تھا۔ اگر چہ زمینداری اور کاشتکاری انہیں وراثت میں ملی تھی لیکن وہ خود ہیرے جواہرات کے بیوپاری بھی تھے جس سے انہوں نے کافی دولت کمائی۔ ان کا کچھ عجیب و غریب ذوق تھا۔ وہ اپنے آس پاس کے علاقوں سے سیپ نکلواتے اور ان سے موتی حاصل کر کے ملک کے دور و دراز کا سفر کرتے اور تاجروں کے ہاتھ فروخت کرتے۔ اس کاروبار کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ انہوں نے اپنے علاقے کے انتہائی پسماندہ لوگوں کو اس سے جوڑ رکھا تھا، تاکہ ان کی معاشی حالت بہتر ہو سکے اور وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکیں۔ جب کہ سیاسی محاذ پر اپنے والد کی طرح ملّی، تعلیمی و رفاہی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور خلافت تحریک کو آگے بڑھانے میں پیش پیش تھے۔ ان کا شمار ایک حب الوطن اور انگریز دشمن کی حیثیت سے بھی ہوتا تھا۔ اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ انہوں نے انگریزوں کے خلاف مقدمات میں گزارا۔ مقدمات لڑتے لڑتے ان کے اندر قانونی صلاحیتیں بدرجہ اتم پروان چڑھ گئی تھیں۔ لہٰذا بستی و اطراف کے لوگ قانونی معاملات میں صلاح و مشورہ کے لیے ان سے رجوع ہوتے تھے۔ اس حیثیت سے سماج میں ان کا بڑا رعب و دبدبہ اور اثر و رسوخ قائم تھا۔ ان کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ انہوں نے اپنے علاقہ میں ہندو مسلم اتحاد کی فضا کو قائم اور پروان چڑھانے میں بڑی کامیابی حاصل کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپس میں متحد ہو کر انہوں نے پرسونی کوٹھی میں ایک زمانے سے رہائش پذیر انگریزوں کو نکال کر ہی دم لیا۔

وہ جنگ آزادی کی تحریک کو فروغ دینے میں بھی پیش پیش رہے۔ ان کا انتقال 64 سال کی عمر میں غالباً 1930ء میں ہو گیا۔ ان کی بستی کی ایک مسجد کے علاوہ ڈمری کٹسری میں پرائمری اسکول، فاطمہ چک میں مدرسہ اصلاح المسلمین اور ہیراما موضع میں ایک مدرسہ سمیت اودے چھپرہ، رام پور کیشو، گوپیا، نیا گاؤں (شیوہر) اور پھونیرہ (موتیہاری) کے چند قدیم مکاتب و مدارس ان کی ملّی، دینی، تعمیری و فلاحی خدمات کی یادگاریں ہیں۔

عبدالمجید کی شادی کفین بستی، ترکی مظفر پور کے ایک معزز خاندان میں محمد مجیب کی دختر بی بی حفیظ النساء سے ہوئی، جن سے انہیں تین لڑکے اور ایک لڑکی ہوئیں۔ سب سے چھوٹے مولانا عبدالحیٔ بیتاب صدیقی تھے، جنہوں نے آگے چل کر بہار میں اردو تحریک کے قائد کے علاوہ مختلف حیثیتوں سے شہرت حاصل کی۔

بیتاب صدیقی: مختصر حالات زندگی

پیدائش اور بچپن:

بیتاب صدیقی نے 1916ء میں بہار کے ایک انتہائی خوشحال اور معزز گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ ان کا اصل نام عبدالحئی، بیتاب تخلص اور شیخ صدیقی برادری سے تعلق رکھنے کی وجہ سے تخلص کے ساتھ صدیقی لکھتے تھے۔ یہی ان کا قلمی نام بھی تھا جس سے انہوں نے شہرت پائی۔ وہ صرف چھ ماہ کے تھے کہ ان کی والدہ بی بی حفیظ النساء انتقال کر گئیں، لہٰذا پھوپھی سرفراز النساء نے انہیں گود لے لیا اور بڑے ناز ونعم میں ان کی پرورش و پرداخت کی۔ والد عبدالمجید کے علاوہ دادا عبدالغنی اور دادی بی بی رضیہ خاتون کی سرپرستی اور نگہداشت میں ان کا بچپن گزرا۔ وہ اپنے دادا کے بیحد عزیز تھے۔ انہوں نے بیتاب صدیقی کو دادا کی محبت و شفقت کے ساتھ ماں کی ممتا بھی دی۔ انہیں کی وجہ سے انہوں نے اپنے علاقہ سے باہر کا سفر اور دیگر مصروفیات کم کر دی تھیں تاکہ وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہوں۔ خاندانی دولت اور خوشحالی کے باوجود ان کے تمام تر اخراجات پھوپھی اٹھاتی رہیں جب کہ تعلیم و تربیت کی ذمہ داری دادی نے اپنے سر لے رکھی تھی۔

بیتاب صدیقی کا نام عبدالحئی سیوان کے ایک جید عالم دین مولانا عبدالصمد اور ڈمری بستی کے ایک بزرگ مولانا عبدالحئی کے مشورے سے آخر الذکر کے نام پر رکھا گیا۔ انہوں نے جب ہوش سنبھالا تو اس زمانہ تک ان کے گھرانوں کے علاوہ قرب و جوار میں دینی و عصری تعلیم کا اچھا خاصا ماحول قائم ہو چکا تھا۔ یہاں تک کہ اس علاقے کی گھریلو خادمائیں اور کھیت کھلیان میں کام کرنے والیاں بھی ایک حد تک زیور علم سے آراستہ ہوتی تھیں۔ لیکن بیتاب صدیقی کا المیہ رہا کہ والدہ کی رحلت اور گھر والوں کے بے جا لاڈ پیار کی وجہ سے ان کی باقاعدہ رسم مکتب سات آٹھ سال کی عمر میں خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف کے اس وقت کے سجادہ نشیں و امیر شریعت، امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ حضرت مولانا سید بدرالدینؒ کے ہاتھوں عمل

میں آئی۔ حضرت سجادہ نشیں کی آمد کو باعث خیر و برکت سمجھتے ہوئے بیتاب صدیقی کے پھوپھی زاد اور خالہ زاد بھائیوں کا مکتب بھی ان کے ساتھ ہی ہوا۔ یہ اور بات ہے کہ اس سے قبل بیتاب صدیقی نے گھریلو طور پر ناظرہ قرآن، عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ دینیات پڑھ لی تھی۔ رسم مکتب کے بعد بیتاب صدیقی کا داخلہ بستی کے ہی ایک مدرسے میں کرایا گیا۔ اس دور کے ان کے اساتذہ میں مولوی عبدالغفور اور مولانا برکت علی بھی تھے جنہوں نے فارسی اور اردو میں انہیں استحکام بخشا۔ ان کے ایک اور استاذ مولوی خلیل نے انہیں علم ریاضی کے ساتھ دینیات اور عصری تعلیم دی۔

بقول بتیاب صدیقی، خاندان کے ایک عالم دین شمس العلماء سید وصی الدین، پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ ایک خاص ذہنیت کے مالک تھے۔ وہ لوگوں میں عصری تعلیم کے فروغ کو ناپسند کرتے تھے اور انہیں زیادہ تر کاشت اور دیگر کاروبار کی طرف متوجہ کرتے تھے۔ وہ بڑے انگریز دوست تھے جب کہ بیتاب صدیقی کا پورا خاندان انگریزوں کا مخالف ہی نہیں بلکہ ان کا دشمن بھی تھا۔ انگریز دشمنی کے یہی اثرات بیتاب صدیقی کے طفلانہ ذہن پر بھی مرتسم ہونے لگے تھے۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک بار ان کے دادا بھائی عبدالصمد اور عبدالواحد دونوں آپس میں شمس العلماء وصی الدین کے ساتھ کچھ اس طرح کی گفتگو میں مصروف تھے جس سے انگریز نوازی اور انگریز دوستی کی بو آ رہی تھی۔ یہ باتیں انہوں نے کان لگا کر سن لی جس نے ان کے ذہن کو جھنجھوڑا، چنانچہ شمس العلماء کے جانے کے بعد انہوں نے ان دونوں سے برجستہ کہا کہ:

> ''آپ انگریزوں کی تعریف کر رہے ہیں، اس خاندان سے تو ہمیشہ ان کی لڑائی رہی۔ آپ لوگ پرسون صاحب (پرسون کوٹھی کا انگریز) سے لڑتے رہے۔ جیل گئے، مقدمہ ہوا۔ پھر چھوٹے دادا بھاگ کر امریکہ گئے اور آپ انگریزوں کے بارے میں اچھے معاملات کا دعویٰ کرتے ہیں؟''

بیتاب صدیقی کے بچپن کی یہ باتیں ان دونوں چھوٹے دادا کو بہت پسند آئیں۔ مگر جب اس کا ذکر انہوں نے شمس العلماء سے کیا تو انہیں ناگوار گزرا۔

تعلیمی راہ کی مزاحمت:

ایک تو گھریلو ناز نخرے کی وجہ سے بیتاب صدیقی کا تعلیمی سلسلہ قدرے تاخیر سے شروع ہوا۔ اس کی تلافی کی کوئی صورت نکلتی کہ شمس العلماء وصی الدین کے نظریات کی مخالفت نے اندر ہی اندر اپنا کام

کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی کوششوں میں اس حد تک کامیاب ہوگئے کہ بیتاب صدیقی کا نام مکتب سے کٹوا کر کاشتکاری کے کاموں میں لگا دیا گیا۔ اِدھر مولانا اپنی سازش پر خوش تھے، اُدھر مکتب سے برطرفی کے غم میں بیتاب صدیقی روز بروز گھلے جا رہے تھے۔ اسی پیچ وتاب میں ماہ دو ماہ گزر گئے، ان کی اس صورتحال کو دیکھ کر پڑوس کی ایک چچی نے جب ان سے ماجرا دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ:

''شمس العلماء صاحب کے کہنے پر پھوپھا نے میری پڑھائی ختم کرادی اور کھیتی باڑی میں لگا دیا۔''

اتفاق سے اس زمانے میں تلہن کی کٹائی ہو رہی تھی، بیتاب صدیقی کا کھیتوں پر آنے جانے کا سلسلہ لگا تھا۔ چنانچہ ایک دن موقع غنیمت پا کر پڑوس کی اسی چچی نے ازراہِ ہمدردی ان کو مشورہ دیا کہ اگر تمہیں پڑھائی جاری رکھنی ہے تو کسی صورت سے یہاں سے بھاگ جاؤ اور مظفر پور یا کسی دوسری جگہ مدرسہ یا اسکول میں نام لکھالو۔ بقول بیتاب صدیقی:

''وہ خاتون تعلیم کی دلدادہ تھیں۔ میری باتیں جب انہیں اچھی طرح سمجھ میں آ گئیں تو انہوں نے مجھے بڑا انقلابی مشورہ دیا کہ آگے پڑھنا ہے تو گھر سے بھاگ جاؤ اور کسی صورت سے تعلیم حاصل کرو۔''

ایامِ طفلی کا ایک انقلابی قدم:

کئی دنوں کے غور وفکر کے بعد ایک دن بیتاب صدیقی نے اپنی پھوپھی سے کچھ پیسوں کی فرمائش کی۔ اس وقت ان کے پاس صرف دو آنے تھے جو انہوں نے دے دیئے۔ انہیں دو آنے کو لے کر وہ کسی ضرورت کا بہانہ بنا کر گھر سے نکل پڑے اور مہیشی (موتیہاری) ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ وہاں ان کے پاس اب صرف ایک آنے بچ گئے تھے۔ اسی بیچ سامنے پلیٹ فارم پر ایک ٹرین لگی تھی، قریب میں ایک ٹکٹ انسپکٹر بھی تھا۔ انہوں نے دل کڑا کر کے اس سے ملاقات کی اور مختصراً اپنا دکھڑا سنا دیا۔ اسی کے ساتھ انہوں نے اپنا یہ مدعا بھی رکھ دیا کہ پیسے نہیں ہیں، پڑھائی کے لیے مظفر پور جانا چاہتا ہوں۔ آپ کہیے تو اسی گاڑی سے چلا جاؤں۔ جب انسپکٹر ان کی باتوں سے مطمئن ہوگیا تو اس نے ایک ڈبہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس میں بیٹھ جانے کو کہا۔ ٹرین کی چیکنگ کرنے کے بعد وہ ان کے پاس آیا اور تمام تفصیلات سنی۔ پژمردہ اور مایوس چہرہ دیکھ کر اسے ترس آ گیا، راستہ میں جو کچھ میسر ہوسکتا تھا اس نے کھلایا پلایا۔ اسے یہ جان کر خوشی بھی ہوئی کہ واقعی یہ لڑکا صرف پڑھنے کے لئے گھر سے بھاگا ہے۔ ٹرین جب مظفر پور کی تو وہ

انہیں اپنے ساتھ لیے اسٹیشن سے قریب ایک مسلم ہوٹل میں پہنچا جس کے پہلو میں ایک مولوی صاحب اپنا کچھ چھوٹا موٹا روزگار چلاتے تھے۔ اس نے بیتاب صدیقی کو مولوی صاحب کے حوالے کرتے ہوئے تاکید کی کہ یہ بچہ پڑھنا چاہتا ہے آپ اس کی تعلیم کا کچھ بندوبست کر دیجیے۔ مولوی صاحب انہیں ایک دن اپنے پاس رکھنے کے بعد دوسرے روز مدرسہ جامع العلوم، مظفر پور کے سکریٹری مولانا نعمت اللہ رضی کے یہاں لے گئے تا کہ وہ ان کی پڑھائی کا کچھ بندوبست کرسکیں۔ مولانا نعمت اللہ نے اس عمر میں بیتاب صدیقی کی صلاحیتوں کے مطابق مدرسہ کے قریب ایک مولوی جمیل ایڈووکیٹ کے یہاں بچوں کا ٹیوشن دلا دیا۔ اسی کے ساتھ مدرسے میں ان کا داخلہ بھی لے لیا۔ اس طرح بیتاب صدیقی مدرسہ جامع العلوم میں پڑھنے کے ساتھ اپنی دیگر ضروریات کی تکمیل میں کسی حد تک خود کفیل ہوگئے۔ ان کی ذہانت سے مدرسہ کے اساتذہ مولانا نعمت اللہ اور مولوی حبیب اللہ بہت متاثر ہوئے۔ دیگر اساتذہ اور طلبہ کے درمیان بھی بیتاب صدیقی اپنی انفرادیت وذہانت کی وجہ سے توجہ کا مرکز بن گئے۔ بالآخر ایک دن یہ راز افشا ہوگیا کہ وہ کس خانوادہ کے چشم وچراغ ہیں۔ چنانچہ ایک عرصہ بعد گھر والوں کو تمام حالات سے جب آگاہی ہوئی تو وہ لوگ مدرسہ جامع العلوم میں آ کر ان سے ملے اور اس کے بعد ان کا آنا جانا شروع ہوگیا اور پھر وہ کبھی ان کی تعلیمی راہ میں حائل نہیں ہوئے بلکہ ان کی ہمت افزائی کے ساتھ ان کے تمام اخراجات کی تکمیل کرتے رہے۔ اسی دوران مدرسہ جامع العلوم کے منتظمین اور اساتذہ پر یہ بات اچھی طرح عیاں ہوگئی کہ بیتاب صدیقی کا گھرانہ کٹر انگریز مخالف ہے، یہی وجہ ہے کہ کم عمری میں یہ لڑکا بھی انگریزوں سے شدید نفرت کرتا ہے۔ اس حیثیت سے وہ اپنے سینئر طلبہ میں مزید ممتاز اور نمایاں ہونے لگے۔ بیتاب صدیقی کے خاندانی حالات وکوائف کا علم جیسے جیسے لوگوں کو ہوا، مدرسے کے اساتذہ وطلبہ کے علاوہ اطراف واکناف میں ان کی مقبولیت بڑھنے لگی۔ مدرسہ جامع العلوم میں تعلیمی سلسلہ جاری تھا کہ مظفر پور ضلع اسکول کے ایک استاذ مولانا عبدالغنی نے ان کی صلاحیتوں اور خاندانی پس منظر کے پیش نظر مشورہ دیا کہ وہ کسی طرح مدرسہ سے نکل کر مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ میں داخلہ لے لیں تا کہ وہاں ان کی صلاحیتیں مزید پروان چڑھ سکیں۔

مظفر پور سے پٹنہ مراجعت:

مولانا عبدالغنی کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ بیتاب صدیقی کے ذہن ودماغ میں جاگزیں ہوگئے۔ ایک دن وہ مدرسہ میں کسی کو اطلاع دیئے بغیر وہاں سے پٹنہ چلے آئے۔ یہاں مدرسہ اسلامیہ شمس

الہدیٰ میں انہوں نے داخلہ لینا چاہا، مگر اس وقت مدرسہ کے ایک استاذ مولانا عبدالماجد جو بیتاب صدیقی کے نام اور خاندان سے بخوبی واقف تھے انہوں نے ان کے داخلہ کی سخت مخالفت کی کیوں کہ انہیں اندیشہ تھا کہ وہ مدرسے میں انگریز مخالف جذبے کو فروغ دے سکتے ہیں۔ مولانا عبدالماجد خود حکومت نواز تھے اور انگریزوں کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے۔ اس لیے بیتاب صدیقی کو یہاں داخلہ لینے میں ناکامی ہوئی اور مدرسہ جامع العلوم، مظفر پور سے بھی تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

بہار شریف کا سفر:

بیتاب صدیقی نے ہمت نہ ہاری اور انہوں نے سیدھا مدرسہ عزیزیہ بہار شریف کا رخ کیا۔ وہاں کے اساتذہ میں ایک ماسٹر عبدالقادر کو انہوں نے اپنے لیے غنیمت جان کر انہیں سارا ماجرا سنا ڈالا، وہ بہت متاثر ہوئے اور سب سے پہلے بہار شریف کے محلّہ محل پر کے ایک رئیس وحید سجاد کے بچوں کا اتالیق مقرر کر دیا، تا کہ ان کے ذاتی اخراجات کی تکمیل کے ساتھ مدرسہ میں داخلہ کی صورت بھی پیدا ہو جائے۔ وحید سجاد شہر کے علاوہ مدرسے میں اپنا اثر ورسوخ رکھتے تھے۔ چنانچہ مدرسہ عزیزیہ کے منتظمین کو بیتاب صدیقی سے وحید سجاد کی قربت کا علم ہوا تو آسانی سے ان کا وہاں داخلہ ہو گیا۔ اس زمانے میں بہار شریف میں مسلم لیگ کا کافی چرچہ تھا اور اس کی تحریکی سرگرمیاں پورے زور پر تھیں۔ ادھر ستم یہ کہ بیتاب صدیقی مسلم لیگ کے کٹر مخالف تھے۔ لیگ کی مخالفت اور قومی تحریک کی سرگرمی میں پورے جوش وخروش کے ساتھ شمولیت نے مدرسہ عزیزیہ ہی نہیں بلکہ پورے شہر میں ان کی شخصیت کو متنازع بنا دیا اور مقبولیت بھی بخشی۔ ستم یہ کہ وحید سجاد، جن کے یہاں ٹیوشن اُن کی آمدنی کا واحد ذریعہ تھی، وہ بھی لیگی تھے۔ اس اندھیرے میں وحید سجاد کے بڑے لڑکے رشید سجاد امید کی کرن بن کر سامنے آئے جو لیگ مخالف اور پکے نیشنلسٹ تھے۔ اسی ذہنی، فکری اور سیاسی ہم آہنگی کی وجہ سے دونوں میں بڑی دوستی ہو گئی۔ لہٰذا ٹیوشن برقرار رہا۔ بیتاب صدیقی کے ساتھ رشید سجاد کا سلوک ایک مشفق بڑے بھائی جیسا تھا۔ اپنی سیاسی وملی سرگرمیوں کو جاری رکھتے ہوئے بیتاب صدیقی نے مدرسہ عزیزیہ سے فوقانیہ کر لینے میں کامیابی حاصل کر لی۔

متولی کے خلاف محاذ آرائی:

مدرسہ عزیزیہ، بہار شریف میں طالب علمی کے دور میں طلبہ اور مقامی باشندوں کے درمیان بیتاب صدیقی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو صغریٰ وقف اسٹیٹ بہار شریف کے متولی ناپسند کرتے تھے، کیوں

کہ ایک طرف بیتاب صدیقی خلافت تحریک میں فعال تھے تو دوسری جانب انگریزوں کی غلامی کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ ان کی سرگرمیوں سے مدرسہ کے طلبہ اور شہر میں ان کی مقبولیت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ طلبہ کے بارے میں متولی کی رائے ویسے بھی اچھی نہیں تھی بلکہ ان کی اکثریت کو وہ ناپسند کرتے تھے۔ چنانچہ بیتاب صدیقی نے طلبہ کی ایک بڑی جماعت کو متحد اور منظّم کر کے ان کے خلاف صف آرائی شروع کر دی۔ شہر میں ایک بڑا جلسہ کیا جس پر پتھراؤ ہوا۔ سنگ باری کے بعد طلبہ اور بھی مشتعل ہو گئے، معاملہ نے کافی طول پکڑ لیا اور متولی کے خلاف احتجاج کا سلسلہ چل پڑا۔ بقول بیتاب صدیقی اس زمانے میں جب کہ طلبہ تعلیمی اداروں میں بھوک ہڑتال کے نام سے واقف تک نہیں تھے، مدرسہ کے طلبہ نے بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ حالات کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے اس وقت کے وزیر اعلیٰ شری کرشن سنہا کو مداخلت کرنی پڑی۔ ایک مجسٹریٹ کو معاملے کی تحقیقات کے لیے تعینات کیا گیا جس نے بیتاب صدیقی کا بیان بطور خاص قلم بند کیا۔ بقول بیتاب صدیقی متولی اور شہر کے بعض لوگوں کی کوشش رہی کہ اس معاملے میں انہیں کسی طرح ماخوذ کر دیا جائے تا کہ سزا ہو جائے۔ مگر جب مجسٹریٹ کی تحقیقاتی رپورٹ میں انہیں بری الذمہ کر دیا گیا تو مدرسہ کی کمیٹی نے اسے اپنی شکست محسوس کرتے ہوئے وقار کا مسئلہ بنایا اور یہ طے کیا کہ وہاں سے ان کا نام کسی صورت سے خارج کر دیا جائے۔ اسی کے ساتھ کمیٹی کو اس کے ردّعمل کا بھی اندیشہ تھا۔ اس سے پہلے کہ کمیٹی کوئی اقدام کرتی بیتاب صدیقی نے پٹنہ آ کر مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے مولوی درجہ میں داخلہ لینے میں کامیابی حاصل کر لی۔

مدرسہ عزیزیہ اور بہار شریف بیتاب صدیقی کی مختلف نوعیت کی تحریکی سرگرمیوں کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہیں سے ان کی شخصیت کی اٹھان ہوئی اور اس نے ان کے مستقبل کے لیے بنیاد فراہم کی۔ شہر میں انہیں بعض بااثر لوگوں کی سرپرستی حاصل تھی ہی مدرسہ کے اساتذہ میں مولانا محمد ابراہیم اور مولانا جنید عالم فاضل دیوبند اور مجاہدین آزادی میں تھے، اصلاح پسند تھے، وہ مذہب کے نام پر خرافات کے سخت مخالفین میں تھے۔ مدرسے اور شہر میں ان کی بڑی مضبوط پوزیشن تھی۔ بیتاب صدیقی کو ان کی پوری حمایت حاصل تھی۔ اسی زمانے میں وہاں ایک استاد محمد حنیف تھے جو اسلامی خطوط پر تعمیری کام میں طلبہ کی معاونت کرتے تھے۔ مدرسے کے طلبہ کو مذہبی اور سیاسی طور پر بیدار کرنے میں ان کا غیر معمولی عمل دخل تھا۔ وہ بھی ان کے سرپرستوں میں تھے۔ ایک اور استاد شمس الدین رمضان پوری کی شخصیت بھی بالخصوص بیتاب صدیقی اور بالعموم مدرسہ کے طلبہ و دیگر نوجوانان کے لیے باعث سعادت تھی۔ وہ ایک طرح

سے طلبہ کے فینانسر تھے۔ انہوں نے طلبہ کی تحریکی سرگرمیوں کو جاری رکھنے میں کبھی پیسہ کی کمی نہیں ہونے دی، بلکہ بڑی فیاضی سے ان کا پورا خرچ خود برداشت کرتے تھے۔ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ میں داخلہ لینے کے بعد بہار شریف بیتاب صدیقی کے اوّلین کارگاہِ عمل کے طور پر رہا اور اس حیثیت سے ان کا برابر وہاں آنا جانا لگا رہا۔

قیدِ زنداں:

بیتاب صدیقی نے اپنی زندگی میں چار مرتبہ قید و بند کی صعوبتیں بھی اٹھائیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی دیوبندی اور ان کے فرزند عزیز الرحمٰن لدھیانوی تحریک آزادی کی مشعل لیے جب پٹنہ آئے تو ان کی حمایت کی پاداش میں پہلی مرتبہ بیتاب صدیقی بھی حراست میں لیے گئے۔ یہ دونوں صف اوّل کے مجاہد آزادی میں تھے لہٰذا انہوں نے پٹنہ آ کر مرد و خواتین کو انگریزوں کی غلامی کے خلاف ہر ممکن جدوجہد اور قربانی کے لئے آمادہ کیا اور ان کے اندر جوش و ولولہ پیدا کیا۔ اسی دوران حکومت انہیں گرفتار کر کے دہلی لے گئی۔ ادھر بیتاب صدیقی نوادہ میں روپوش ہو گئے تھے جہاں سے انہیں گرفتار کر کے نوادہ جیل بھیج دیا گیا۔ تین دنوں بعد جب ان کی پیشی ہوئی تو جیل سپرنٹنڈنٹ جو بہار شریف میں ان کی تحریک خلافت کی سرگرمیوں سے اچھی طرح واقف تھا اس نوٹ کے ساتھ رہا کر دیا کہ اگر انہیں مزید قید میں رکھا گیا تو پٹنہ اور بہار شریف کے طلبہ و نوجوان کو وہ مشتعل کر کے حکومت کی ناک میں دم کر دیں گے۔

بیتاب صدیقی کی دوسری گرفتاری اگست 1966ء میں عمل میں آئی۔ اس زمانہ میں وزیراعلیٰ بہار، کے بی سہائے کا دور دورہ تھا۔ وہ اپنے مخالفوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کے اس موقف کے باوجود بیتاب صدیقی ان کی بعض پالیسیوں پر اعتراض کرتے رہے۔ اسی دوران جلسے جلوس اور مظاہروں کے علاوہ روزنامہ 'سنگم'، پٹنہ میں ان کی حکومت مخالف تحریریں بھی شائع ہوتی رہیں۔ چنانچہ انہیں حکومت کے خلاف سرگرمیوں میں شامل رہنے کے الزام میں گرفتار کر کے نوادہ جیل بھیج دیا گیا، کچھ دنوں بعد وہاں سے بہار شریف جیل منتقل کر کے پٹنہ لایا گیا جہاں سے تیسرے دن ان کی رہائی عمل میں آئی۔ ان پر طلبہ کو بھڑکانے اور حکومت مخالف رویے میں ملوث رہنے جیسے دفعات قائم کیے گئے تھے۔ اس سے قبل 1965ء میں غلام سرور کے ساتھ D.I.R کے تحت ان کی گرفتاری عمل میں آئی۔

آزادی کی قسم:

سال 37-1936ء کے آس پاس بیتاب صدیقی کی عمر کوئی بیس اکیس سال رہی ہوگی۔ بچپن سے نکل کر نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہوئے نہ ایام شباب کے دنوں کا کیف و سرور میسر آیا نہ راتوں کی رعنائیاں بلکہ سارے کا سارا جوش و خروش اور جنون و خرد سامراجی طاقتوں کے علاوہ متعدد طرح کی جدوجہد کی نذر ہو گئیں۔ آزادی کا سودا سر پر ایسا سوار ہوا کہ پہاڑوں سے ٹکرانے اور سمندروں کی لہروں کو گرفت میں لے لینے کا حوصلہ تھا۔ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ میں طالب علمی کے دوران گھوڑے پر سوار ہو کر انگریز واپس جاؤ کے نعرے لکھے ہوئے پمفلیٹ بانٹتے، تو کبھی توڑ پھوڑ کرتے ہوئے، انگریز سپاہیوں سے مڈبھیڑ اور ہاتھا پائی کی نوبت بھی آ جاتی اور اگر کسی نے ہاتھوں سے پوسٹر چھین لیا تو اس کے خلاف زہر اگلنے کے لیے زبان تو تھی ہی۔ اسی دوران تعلیم سے فراغت کے بعد خاندان والوں کی طرف سے ان پر شادی کا دباؤ بڑھنے لگا۔ جب کہ مدرسہ کے بعض معمر اساتذہ نے انہیں ملازمت سے لگ جانے کا مشورہ دیا۔ لیکن انہوں نے اس وقت جو دو قسمیں کھا رکھی تھیں ان میں اوّل یہ کہ جب تک ہندوستان آزاد نہیں ہوگا وہ شادی نہیں کریں گے دوم کہ غلام ملک میں کوئی سرکاری ملازمت کے لیے وہ امیدوار نہیں ہوں گے۔

ازدواجی زندگی کا آغاز:

آزادی کے دو سال بعد بیتاب صدیقی کی شادی ان کی ایک رشتہ دار پھول باندی بیگم سے 1949ء میں ہوئی۔ وہ میگھوا، کیسریا ضلع مشرقی چمپارن کی رہنے والی تھیں۔ ان کے والد رجسٹرار کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کی اردو دوستی اور اردو نوازی کی وجہ سے بیتاب صدیقی کو ان سے قربت حاصل ہوگئی جو بعد میں ان کی صاحبزادی سے مناکحت میں بدل گئی۔ لیکن عقد کے بعد دو سال تک وہ اپنی اہلیہ کو رخصت کر کے اپنے گھر نہیں لائے اس کی وجہ وہاں رائج ایک قبیح رسم یہ ٹھہری کہ ان کے خسر کے خاندان سمیت گاؤں والے اپنی لڑکیوں کو متوفی کی وراثت میں کوئی حصہ نہیں دیتے تھے اور یہ رواج انہوں نے برادرانِ وطن سے اخذ کر لی تھی۔ وہاں دیندار اور مذہبی کہے جانے والے لوگوں میں بھی وراثت کی تقسیم کا کوئی تصور نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی سسرال سمیت پوری مسلم بستی میں اس کے خلاف بیداری مہم چھیڑ دی۔ جس میں انہیں دو سال لگ گئے۔ جب بستی کی اکثریت اس قبیح رسم سے دست بردار اور شرعی حکم کے مطابق وراثت میں اپنی لڑکیوں کو بھی حصہ دینے پر آمادہ ہوگئی تو 1951ء میں ان کی اہلیہ کی رخصتی ہوئی۔ در

اصل یہ لڑائی ان کی ذاتی نہیں بلکہ ایک غیر شرعی رواج اور حق تلفی کے خلاف تھی۔ اس کے بعد سے ان کی خوشگوار ازدواجی زندگی کا آغاز ہو گیا۔ پھول باندی بیگم سے انہیں ایک لڑکا اور تین لڑکیاں ہیں۔ ایک پڑھی لکھی، دیندار اور وفا شعار رفیقہ حیات تھیں۔ بیتاب صدیقی کی تحریکی مصروفیات اور ان کے آئے دن کے سفر کے پیش نظر گھر کی تمام تر ذمہ داریاں انہوں نے اپنے سر لے رکھی تھیں۔ اس کے لیے انہیں وقفے وقفے سے اپنے میکے بھی رہنا پڑا، تاکہ بیتاب صدیقی کو پوری آزادی کے ساتھ تحریکی کام کرنے کا موقع ملتا رہے۔ گھریلو ضروریات کی تکمیل کے لیے وہ اپنے میکے سے کافی رقم بھی لاتی رہیں۔ ایک طرف ان کی سسرال ڈمری کٹسری میں آئے دن ڈاکوؤں کا حملہ اور برسات میں سیلاب کی یورش تو دوسری جانب وہاں بال بچوں کی مناسب تعلیم اور علاج ومعالجہ کی دشواریاں، چنانچہ پٹنہ آکر بھی انہیں کرایے کے ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقلی کا سامنا کرنا پڑا، لیکن اپنی تمام تر خانگی دشواریوں کے باوجود وہ لب پر کبھی حرف شکایت نہیں لائیں۔ ادھر بیتاب صدیقی گھریلو ذمہ داریوں سے لاپرواہ دن رات اپنے مشن میں لگے رہتے۔ آخری عمر میں انہوں نے تمام جائداد کو اپنی اولاد میں تقسیم کر کے نیو عظیم آباد کالونی، پٹنہ میں ایک مکان تعمیر کرایا۔

بیتاب صدیقی نے ایک ملاقات میں راقم سے کہا تھا :

''پھول باندی بیگم نے بڑی قربانیاں دیں۔ اپنی تمام خواہشات کو دبائے ان کی سرگرمیوں کو جاری رکھنے میں ان کی حیثیت ایک خاموش سپاہی جیسی تھی۔ آخری وقت میں انہیں ملال رہا کہ انہوں نے اپنی رفیق حیات کو وقت بالکل نہیں دیا کیوں کہ انہیں اپنی گھریلو زندگی کے لیے فرصت ہی نہیں تھی۔ اردو تحریک میں ان کی بالواسطہ قربانیوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔''

بیتاب صدیقی کے انتقال کے سات برسوں بعد 27 مارچ 2005ء کو وہ بھی رحلت کر گئیں۔

ملازمت:

تعلیم سے فراغت کے بعد بیتاب صدیقی عارضی طور پر کچھ دنوں کے لیے مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ میں درس وتدریس سے وابستہ ہو گئے تھے۔ آزادی کے فوراً بعد 1948ء میں ان کی تقرری معروف تعلیمی ادارہ راجہ رام موہن رائے سیمنری، پٹنہ میں اردو اور فارسی کے استاذ کی حیثیت سے ہوئی جہاں سے 1985ء میں سبکدوش ہوئے۔ سبکدوشی کے بعد مزید دو سال کے لیے ان کی ملازمت میں توسیع کر دی گئی۔

راجہ رام موہن رائے سیمنری ان کے مزاج اور اردو کی تحریکی سرگرمیوں سے پوری طرح ہم آہنگ تھا۔ اسکول قلب شہر میں ہونے کی وجہ سے بھی انہیں بڑی آسانی تھی۔ دوسرے یہ کہ یہاں سے تبادلے کی کوئی گنجائش نہیں تھی جس کی وجہ سے وہ اس اسکول سے پوری یکسوئی سے وابستہ رہے، لیکن یہاں کی ملازمت کا سب سے روشن پہلو یہ تھا کہ اسکول کے پرنسپل کے والد ان کے عقیدت مندوں اور اردو دوستوں میں تھے۔ ان کی سبکدوشی کے بعد ان کے فرزند کے.کے. پودار بھی پوری زندگی اردو تحریک سے وابستہ رہے۔ وہ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ کے فعال رکن بھی تھے جب انجمن دو حصوں میں منقسم ہو گئی، بہار انجمن ترقی اردو کے ساتھ ہو گئے۔ اور صدر انجمن پروفیسر عبدالمغنی کے ساتھ مل کر انہوں نے بہار میں اردو کو ثانوی زبان کا درجہ دلانے میں اپنا بھرپور تعاون دیا۔ ان کی وجہ سے بعض دوسرے سیکولر غیر مسلم بھی اردو تحریک میں شامل ہوئے۔

راجہ رام موہن رائے سیمنری میں پروفیسر احسان اشرف، ریاض عظیم آبادی، شوکت حیات، شاہ طارق انور، انجم عالم، شان الرحمٰن وغیرہ بیتاب صدیقی کے شاگردوں میں تھے، جنہوں نے آگے چل کر اپنے اپنے شعبوں میں ناموری حاصل کرنے کے ساتھ اردو زبان وادب کی بھی قابل قدر خدمات انجام دیں۔

مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں داخلہ:

بیتاب صدیقی مدرسہ جامع العلوم مظفر پور میں زیر تعلیم رہتے ہوئے مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں داخلہ کے خواہشمند تھے اور اس غرض سے وہاں تعلیم ادھوری چھوڑ کر انہوں نے مدرسہ ہذا کا رخ کیا تھا۔ مگر اس وقت ان کے داخلے کی مخالفت کی گئی لہٰذا انہوں نے مدرسہ عزیزیہ، بہار شریف میں اپنا نام لکھوالیا تھا۔ وہاں سے فوقانیہ کرنے کے بعد انہوں نے مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ میں مولوی درجہ میں داخلہ لینے میں کامیابی حاصل کر لی اور 45-1940ء کے عرصہ میں مولوی، عالم اور فاضل کے طالب علم رہے۔ فاضل میں انہیں اوّل پوزیشن حاصل ہوئی اور گولڈ مڈل ملا۔ ان کی شاندار کامیابی پر مدرسہ نے بھی خصوصی انعام سے نوازا۔ یہاں دوران تعلیم انہوں نے طلبہ واساتذہ میں کافی مقبولیت حاصل کر لی تھی اور تحریک آزادی میں بھی متحرک تھے۔ اپنے تعلیمی سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے عمائدین شہر سے ان کے تعلقات بہت وسیع ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ متعدد قومی وریاستی سطح کے سیاسی، ملی، مذہبی شخصیتوں کے علاوہ دانشوروں اور صحافیوں سے بھی روابط تھے۔ وہ مدرسے کے طلبا کی تنظیم 'جمعیۃ الطلباء' کے جنرل سکریٹری بھی رہے۔ مدرسے میں طالب علمی کے دوران انہوں نے 'بزم اردو' نامی ایک انجمن غالبًا

1942ء قائم کی تھی جس کا مقصد اردو کی ترقی وترویج تھی۔ 'بزم اردو' اگر چہ مدرسے کی سطح پر محدود سی انجمن تھی لیکن بعد میں اس کا دائرہ کار بڑھتا گیا، جس کی سالمی سے اردو نوازوں کا ایک انتہائی موثر اور فعال حلقہ اس کے بینر تلے تیار ہوگیا تھا۔ اسی کے ساتھ اردو کے حوالے سے بیتاب صدیقی کی قیادت بھی تسلیم کی جانے لگی۔ جس کا مقصد اردو کو گھر گھر پہنچانا تھا۔

ادارہ جاتی و تنظیمی سرگرمیاں:

بہار ریاستی انجمن ترقی اردو سے بیتاب صدیقی کا وہی تعلق تھا جو ان کے جسم سے سانسوں کا تھا۔ ان کی زندگی کا سب سے مقدم اور روشن پہلو اردو تحریک سے ان کی وابستگی تھی۔ آزادی سے پہلے انہوں نے خود اردو کے فروغ وبقا کے لیے 'بزم اردو' اور 'اردو سکھاؤ مہم' نامی دو اردو تنظیموں کی بنیاد ڈالی تھی اور دو ہفتہ وار اردو اخبار 'طوفان' پٹنہ اور 'مومن دنیا' کا اجرا ان کی ادارت میں عمل میں آیا تھا، مگر 1951ء میں بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے قیام کے ساتھ ہمیشہ کے لیے اسے حرز جاں بنالیا۔ کہنے کو تو انہوں نے انجمن کے اساسی رکن سے لے کر جوائنٹ سکریٹری، جنرل سکریٹری اور صدر نشیں تک کا سفر طے کیا، لیکن عملاً وہ اردو کے ایک بے لوث خادم اور زبردست مجاہد تھے۔ اردو تحریک انہیں ایمان کی حد تک عزیز تھی۔ اردو کے تحفظ، اس کے آئینی حقوق کی بازیابی اور اس کی ہمہ جہت ترقی کے لیے جب تک وہ بقید حیات رہے جسم وجان کی دولت لٹاتے رہے۔ اردو کے فروغ وبقا کے لیے انہوں نے مرکزی انجمن ترقی اردو کا بھی بھرپور تعاون کیا۔ اردو تحریک کی راہ میں بیتاب صدیقی کی قربانیاں بے نظیر اور لائق صد آفریں ہیں۔

چیئرمین بہار اسٹیٹ سنی وقف بورڈ:

بیتاب صدیقی 79-1977ء بہار اسٹیٹ سنی وقف بورڈ کے چیئرمین رہے۔ اپنی مدت کارکردگی کے دوران انہوں نے بورڈ سے بدعنوانیوں کو دور کرنے کی بھرپور کوششیں کیں۔ ان کے زمانے میں چترا میں وقف بورڈ کا ایک مقدمہ تھا۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ فریقین نے آپسی سانٹھ گانٹھ کر کے اسے رفع دفع کر دیا تھا۔ جب بیتاب صدیقی نے اپنا عہدہ سنبھالا تو انہوں نے اس کے VERDICT کو چیلنج کیا۔ یہ معاملہ پٹنہ ہائی کورٹ پہنچا۔ ہائی کورٹ نے ان کی حمایت کی۔ جب فریق اسے سپریم کورٹ لے کر پہنچا تو عدالت عظمیٰ نے بھی ان کے موقف کی تائید کی۔ اگر چہ بورڈ کے چیئرمین کی حیثیت سے ان کی مدت تقریباً دو سال رہی، لیکن اس قلیل عرصہ میں انہوں نے کئی اہم کارنامے انجام

دیے۔ مثلاً مراد پور وقف مارکیٹ، پٹنہ کے علاوہ ہزاری باغ، رانچی، جمشید پور، کٹیہار کے اوقاف کے معاملات ان کے دور میں سلجھائے گئے اور جن لوگوں نے وقف کی املاک پر ناجائز قبضہ کر رکھا تھا ان سے اسے آزاد کرالیا گیا۔ کچھ معاملوں میں فریقین کے درمیان صلح کے ذریعہ انہیں ضابطے کا پابند بنایا۔ وقف املاک کے خرد برد کے بعض معاملات میں ان پر طرح طرح سے دباؤ بنانے کی کوششیں بھی کی گئیں اور لالچ بھی دیا گیا مگر وہ مطمئن تھے کہ انہوں نے قوم وملت کے اثاثے کا سودا نہیں کیا۔

رکن بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ:

وہ شروع سے ہی مدرسہ ایجوکیشن بورڈ تحریک سے وابستہ رہے اور اسے آگے بڑھانے میں اپنا گرانقدر کارنامے انجام دیتے رہے۔ اس سلسلے میں روزنامہ 'سنگم' پٹنہ کی فائلیں ان کی کارگزاریوں سے بھری پڑی ہیں۔ مدرسہ تحریک سے وابستگی کی بنیاد پر حکومت سے برابر ٹکراؤ کی نوبتیں بھی آتی رہیں۔ بورڈ کے نصاب سے بھی انہیں غیر معمولی دلچسپی تھی اور اس میں بہتری لانے کے لیے انہوں نے بڑی جدوجہد بھی کی۔ انہوں نے مرکزی حکومت سے پرزور مطالبہ بھی کیا تھا کہ وسطانیہ اور فوقانیہ سطح تک خطاطی کو لازمی قرار دیا جائے اور خطاط معلم کی بحالی کی جائے تا کہ اس عظیم فن کو مٹنے سے بچایا جاسکے۔

ممبر بہار اسکول اکزامنیشن بورڈ:

78-1974ء کے عرصہ میں وہ بہار اسکول اکزامنیشن بورڈ کے ممبر رہے۔ اس دوران بورڈ کے تمام شعبہ میں خاطر خواہ اصلاح اور بہتری لانے کے علاوہ نصاب میں شامل کتابوں کو اردو و دیگر علاقائی زبانوں میں شائع کر کے بروقت اسے طلبہ کو فراہم کرانا ان کی اوّلین ترجیحات میں شامل تھیں۔ اس کے لیے وہ بہار اسٹیٹ ٹیکسٹ بک کارپوریشن سے لگاتار رابطہ میں رہتے تھے اور اسے اردو سمیت شیڈول 8 کے تحت تمام علاقائی زبانوں کی کتابوں کی اشاعت کی طرف متوجہ کرتے رہتے تھے۔

رکن مجلس عاملہ بہار اردو اکادمی:

شاہ مشتاق احمد 81-1977ء بہار اردو اکادمی کے سکریٹری رہے۔ اس دور میں بیتاب صدیقی اکادمی کی مجلس عاملہ کے رکن تھے۔ اکادمی کو راج بھون کے حصار سے باہر نکالنے میں جن لوگوں نے غیر معمولی کارنامے انجام دیے ان میں بیتاب صدیقی بھی اہم تھے۔ اس زمانے میں اور بھی کئی فیصلے لیے گئے تھے جن میں بعض پر عمل درآمد نہیں ہوسکا۔ البتہ 'جشن شاد' کی ابتدا اس دور کی یادگار ہے۔

اہم واقعاتِ زندگی:

بیتاب صدیقی کی تقریباً 82 سالہ زندگی میں کون کون سے غیر معمولی واقعات رونما ہوئے ان کی تفصیلات کا یہاں موقع نہیں، البتہ ان کی حیات میں چند ایسے لمحات ضرور آئے جن کے سرے کہیں نہ کہیں اردو تحریک سے ملتے ہیں۔ ان میں چند بطور نمونہ پیش ہیں:

(۱) 1972-73ء میں وہ سخت علیل ہو کر پی ایم سی ایچ میں داخل ہوئے۔ ان کا Survical Bone Slip ہو گیا تھا جو بعد میں Relopharingeal Abses کی بھیانک شکل اختیار کر گیا۔ ان کی علالت کی خبریں روزنامہ 'سنگم' پٹنہ اور دوسرے اخباروں میں پابندی سے شائع ہوتی تھیں۔ جن سے ان کے شناسا واقف ہوتے رہتے تھے۔ اسپتال میں غلام سرور، شاہ مشتاق احمد، پروفیسر عبدالمغنی، ہارون رشید وغیرہ نے ان کی تیمارداری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ اس زمانہ میں عبدالغفور (جولائی 1972 تا اپریل 1975ء) بہار کے وزیر اعلیٰ اور کیدار پانڈے وزیر صحت تھے۔ کیدار پانڈے ایک بار بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے ہاتھوں پارلیمانی انتخاب میں شکست کا مزہ چکھ چکے تھے۔ ان سے غلام سرور اور بیتاب صدیقی سمیت انجمن کے متعدد قائدین سے بڑے گہرے روابط تھے۔ اس زمانے میں پی. ایم. سی. ایچ. میں ای. این. ٹی. کے ماہر ڈاکٹر ایس کے رائے تھے جو بیتاب صدیقی کے معالج خاص تھے۔ مرض اور علاج نے بہت طول پکڑ لیا۔ چنانچہ اسپتال کے جنرل وارڈ سے انہیں کوٹیج میں منتقل کر دیا گیا۔ وزیر صحت نے انہیں خصوصی درجے کا مریض تسلیم کرتے ہوئے سرکاری مراعات کا اعلان کر دیا۔ بیتاب صدیقی کی علالت کو دیکھتے ہوئے غلام سرور بھی وزیر صحت کے فیصلے سے متفق ہو گئے۔ اسی دوران ایک دن ان کا گلا چوک کر گیا۔ جس کی وجہ سے کئی آپریشن کا سامنا کرنا پڑا۔ ایمرجنسی کے دور میں ویسے بھی وہاں اسپتال کا عملہ چاق و چوبند تھا۔ چنانچہ مرض کی شدت کے پیش نظر انہیں پورے 22 ماہ اسپتال میں زیر علاج رہنا پڑا۔ جب ان کے اخراج کا وقت آیا تو عام مریضوں کی طرح انہیں بل تھما دیا گیا اور خصوصی مراعات دینے کا وزیر صحت کا اعلان صدا بہ صحرا ثابت ہوا۔ بیتاب صدیقی کے اہل خانہ نے فوراً پیسوں کا انتظام کر کے بل کی ادائیگی کر دی، لیکن ہیلتھ سکریٹری/کمشنر کے ذریعہ جیسے ہی اس کی اطلاع کیدار پانڈے کو ملی انہیں بڑی سبکی اور شرمندگی ہوئی۔ بقول بیتاب صدیقی فوراً انہوں نے از راہِ ہمدردی اپنی جیب خاص سے چند سو روپے غلام سرور کے حوالے کیے۔ غلام سرور نے یہ کہہ کر ان کی پیشکش مسترد کر دی کہ یہ رقم ہم بھی دے سکتے ہیں۔ اسی درمیان غیر منقسم بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے چند اہم ذمہ داروں نے مصالحت کرانے کی غرض سے

یا اپنی ذاتی ساکھ برقرار رکھنے کے لیے کیدار پانڈے سے وہ رقم اس وعدے کے ساتھ لے لی کہ اسے وہ بیتاب صدیقی کو دے دیں گے اور ان کے ہاتھوں سے لینے میں انہیں کوئی تامل نہ ہوگا۔ ایک دن وہ رقم ان لوگوں نے دھوکے سے ان کے بستر کے سرہانے رکھ دی۔ جو وہاں سے سرور صاحب کے پاس پہنچی جسے انہوں نے کیدار پانڈے کو واپس کر دیا۔ ان پیسوں کو لے کر مذکورہ حضرات سے تعلقات تو خراب ہوئے ہی اسی دن سے نفاق کا بیج پڑ گیا، جو آگے چل کر انجمن کی تقسیم کا ایک سبب بھی ہوا۔ اسی پیسے کو لے کر بیتاب صدیقی کے اسکول کے پرنسپل سے بھی تعلقات خراب ہو گئے جس کا اثر ریٹائرمنٹ کے بعد ان کی پنشن پر پڑا۔

(۲) بیتاب صدیقی روبہ صحت ہونے کے بعد کوئری ٹولہ پٹنہ میں کرائے کے ایک مکان میں رہتے تھے۔ ان کی طویل علالت کے سبب تحریک کا جو کام متاثر ہوا اس کی تلافی کے لیے غلام سرور سے ملنے دفتر 'سنگم' جاتے جہاں گفتگو کا طویل سلسلہ جاری رہتا۔ ایمرجنسی اور اس کے فوراً بعد والا زمانہ بڑا ہیجانی تھا اس لیے بیتاب صدیقی کا زیادہ تر وقت گھر سے باہر ہی گزرتا۔ ایک دن بیتاب صدیقی 'سنگم' میں انجمن کے رفقاء کے ساتھ کسی ضروری گفت و شنید میں مصروف تھے۔ شب کے 12-11 بجے کے آس پاس کا وقت رہا ہوگا۔ جب دیر رات گئے وہ گھر نہیں پہنچے تو گھر والوں کو تشویش ہوئی اور ان کے فرزند خورشید انور دفتر 'سنگم' آئے اور انہیں گھر چلنے کے لیے اصرار کرنے لگے، لیکن بیتاب صدیقی ان سے بے نیاز محو گفتگو تھے۔ جب بیٹے نے پھر ٹوکا تو سرور صاحب نے ترش لہجے میں کہا: ''ارے بیتاب! تم اس کے باپ ہو کہ یہ تمہارا باپ ہے؟'' پھر کیا تھا بیتاب صاحب کے ہاتھ میں جو ڈنڈا تھا اسے اٹھا کر لڑکے پر ایسا رسید کیا کہ ایک انگلی سے ناخن اسی وقت نکل کر الگ ہو گیا اور خون بہنے لگا۔ پڑوس کے ڈاکٹر وارث نے انگلی کی مرہم پٹی کی۔ بقول بیتاب صدیقی نادان لڑکے نے اس وقت اپنے باپ کے ایک دیرینہ رفیق کو ظالم انسان سمجھا ہوگا۔ مگر غلام سرور صاحب کا کیا مقام تھا اسے مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔

(۳) بیتاب صدیقی کی زندگی میں اکتوبر 1996ء سے راقم الحروف نے روزنامہ 'سنگم'، پٹنہ میں 'حیات بیتاب' کے عنوان سے قسط وار مضمون کی اشاعت کے سلسلے کا آغاز کیا تھا، جو ادارتی صفحہ پر نمایاں طور پر سولہ سترہ قسطوں میں اخبار کے چیف ایڈیٹر محمد مظاہر الدین ایڈووکیٹ کے ذیل کے ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ اس نوٹ کے مطالعہ سے بیتاب صدیقی کے عمر کی آخری منزل میں بھی ان کے تحریکی جنون، جذبہ شوق اور انہماک کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

''ریاست بہار میں مابعد آزادئ وطن فسطائی اور فرقہ پرست اعلیٰ ہندوؤں کی عصبیت کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتاری گئی زندہ جاوید زبان اردو کو حیات ثانی بخشنے والی ریاستی انجمن ترقی اردو کے جن چار مجاہدین اور دیگر بانیان تحریک کے نام بہار کی اردو تحریک کی تاریخ میں سنہرے حرفوں میں لکھے جائیں گے ان میں حضرت مولانا عبدالحئی بیتاب صدیقی کا نام نامی اسم گرامی ان کے بے پایاں اخلاص، قابل قدر بے نیازی، بے لوث جد وجہد، عمل پیہم اور اردو تحریک کے لیے اپنی حقیر جان جان آفرین کے حوالے کرنے کے جنون کی حد تک سرفروشانہ عزم کے مختلف النوع انوار وضیاء کے ساتھ اردو نسل کی آنے والی پیڑھیوں کے لیے ایک روشن مینار کی حیثیت رکھے گا۔

اردو سے حضرت مولانا بیتاب صدیقی کی ایمان کی حد تک محبت وچاہت کی ایک مثال میرے ذاتی مشاہدے میں آئی ہے۔ پٹنہ سٹی میں جناب ذکی وارثی کے یہاں ریاستی انجمن ترقی اردو کی میٹنگ ہونی تھی، 82 سالہ حضرت مولانا کو میٹنگ میں لے جانے کی ذمہ داری جناب غلام سرور نے مجھے اور جناب نجم الہدیٰ کو سونپی تھی۔ نجم الہدیٰ کی بینائی کی کمزوری کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں بطور احتیاط حضرت مولانا کی رہائش گاہ واقع درگاہ، پٹنہ خود ہی پہنچ گیا۔ وہ بستر پر بخار میں پڑے تھے۔ میں نے انہیں ٹٹول کر اور آواز دیتے ہوئے اٹھانے کی کوشش کی۔ آواز سن کر مگر بغیر پہچانے کسمساتے ہوئے کروٹ بدل لی اور کہا ---- بدن ہاتھ میں درد ہے ---- بخار سا لگ رہا ہے مجھے ابھی سونے دو۔ غالباً انہوں نے یہ سمجھا کہ کوئی گھر کا فرد ان کو اٹھا رہا ہے۔ لیکن جب میں نے بہت آہستہ سے کہا کہ مولانا! سٹی میں انجمن کی میٹنگ بھی ہے۔ یہ بات مولانا نے ایسے سنی جیسے کہ سانپ کے کان میں پڑ گئی ہو۔ لہراتے ہوئے بستر سے اٹھے۔ دھم سے کھڑے ہوگئے۔ اور ---- مظاہر! چلو چلو۔ دیر ہوگئی۔ یاد ہی نہیں رہا وغیرہ۔ عموماً لوگ ایسی حالت میں ہاتھ منہ دھو کر لباس بدلتے ہیں۔ لیکن مولانا نے پہلے شیروانی چڑھائی۔ بیسن میں اس کے بعد ہاتھ منہ دھویا اور میرے ساتھ سٹی چل پڑے۔ بخار 102 سے کم نہیں رہا ہوگا۔ اردو اور اردو تحریک سے ان کی وارفتگی اور جانثاری کے ہم نے اور بھی مشاہدے کیے ہیں ---- ''

(روزنامہ 'سنگم'، پٹنہ 1996-10-19)

وفات:

عمر طبعی کو پہنچ کر رفتہ رفتہ بیتاب صدیقی کی صحت گرتی گئی یہاں تک کہ 7 دسمبر 1998ء کو پٹنہ میں واقع اپنی رہائش گاہ پر ان کا انتقال پرملال ہوگیا۔ اسی دن بعد نماز عصر شاہ گنج قبرستان، پٹنہ میں تدفین عمل میں آئی۔ ان کی رحلت پر بہار قانون ساز کونسل نے اپنے 132 ویں اجلاس میں اظہار تعزیت ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

''9 دسمبر 1998ء کو مجاہد آزادی اور اردو کے خدمت گزار محترم بیتاب صدیقی کا انتقال ہوگیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر تقریباً 85 برس تھی۔

مرحوم صدیقی کی پیدائش 1913ء میں سیتامڑھی ضلع کے ڈمری گاؤں میں ہوئی تھی۔ وہ پٹنہ کے راجا رام موہن رائے سیمنری میں معلم تھے۔ وہ ریاستی سنی وقف بورڈ کے چیئرمین بھی رہے۔

مرحوم صدیقی ایک اہم مجاہد آزادی تھے۔ سیاست کے ساتھ وہ صحافت سے بھی جڑے رہے۔ 'مومن دنیا'، 'ساتھی'، اور 'سنگم' اخبارات میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

بہار میں اردو زبان کی ترقی اور اس کے آئینی حقوق کے لیے چلنے والی عوامی تحریک میں انہوں نے قابل ذکر خدمات انجام دیں۔ مرحوم صدیقی کے انتقال سے ہم سبھوں کو انتہائی غم ہے۔

خدا مرحوم کی مغفرت فرمائے اور ان کے غمزدہ خاندان کو صبر وتحمل عطا کرے''۔

(31 دسمبر 1998ء)

پروفیسر عبدالمغنی نے اُن کی رحلت پر جس طرح اُنھیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے وہ حسب ذیل ہے:

مولانا بیتاب صدیقی مرحوم اردو زبان کے ان فدائیوں اور خدمت گزاروں میں تھے جنھوں نے آزاد ہندوستان میں اُردو کے تحفظ وترقی کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اس سلسلے میں ان کا انہاک ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک مدت تک انجمن ترقی اردو بہار کی تنظیم بھی وہی تھے، کارکن بھی وہی اور دفتر بھی وہی۔ وہ گویا شب وروز اردو کی فکر میں ڈوبے رہتے تھے۔ ان کی اس محویت کے افسانے پٹنہ اور بہار کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بے شمار واقعات ہیں، جن کے بیان کے لیے ایک مستقل کتاب چاہیے۔

میں نے اندر سے اور یونیورسٹی کے اپنے تعلیمی دَور میں ہی ان سے قربت حاصل کی۔ وہ اکثر میرے پاس انجمن کی تجاویز سے لے کر یادداشتوں کی ترتیب تک کے لیے تشریف لاتے تھے۔ اس کے علاوہ میرے ان کے درمیان مختلف تحریکی و تنظیمی مسائل پر تبادلۂ خیال ہوتا رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں کالج کے تھرڈ اِیر میں ہی انجمن کا جوائینٹ جنرل سکریٹری بنا دیا گیا، گرچہ کچھ دنوں بعد میں اس عہدے سے الگ ہوگیا۔ لیکن لکچرر ہونے کے چند سال بعد ہی مجھے انجمن کے کلیدی عہدوں کی پیش کش بار بار کی گئی۔ اس کے باوجود ۹۴ء تک میں نے کوئی عہدہ قبول نہیں کیا۔ اس دور میں جناب غلام سرور، جناب شاہ مشتاق احمد اور جناب بیتاب صدیقی کے ساتھ میں ایک مربّع کا سب سے کم سِن رکن رہا اور ہم لوگوں نے مل کر متعدد مہمّات سرکیں، جن میں زبان کے علاوہ بھی اردو آبادی کے تمام اجتماعی اور عوامی مسایل شامل رہے۔

مجھے یاد آتا ہے کہ ایک بار مشہور افسانہ نگار شین مظفر پوری نے مولانا بیتاب صدیقی پر ایک مضمون میں یہ شعر درج کیا تھا :

تمام عمر جلی شمع انجمن کے لئے — خیال تک نہ کیا اہلِ انجمن نے کبھی

ممکن ہے کہ شعر کے بعض الفاظ مجھے یاد نہ ہوں یا مصرعوں کی ترتیب مختلف ہو، مگر مفہوم واضح ہے اور ایک حد تک انجمن میں مولانا بیتاب صدیقی کی زندگی پر صادق آتا ہے۔

بلاشبہ مولانا ایک مجاہدِ اردو تھے اور انہوں نے اپنی حد تک اردو کی خدمت میں ہر قسم کے ایثار و قربانی سے کام لیا۔ اس حقیقت کا شعور کم از کم بہار کی اردو آبادی کو ہونا چاہئے اور موصوف کے نام پر کوئی یادگار قائم کی جانی چاہیے۔

(سطور اوّلین از۔ عبدالمغنی 'مرّیخ'، پٹنہ۔ اپریل۔ جون ۱۹۹۹ء)

بیتاب صدیقی: ایک مجاہد آزادی

(ایک تحریر کے حوالے سے)

بیتاب صدیقی کے خاندانی حالات اور ان کے شخصی کوائف کے بیان میں کہیں مفصل اور کہیں اشاروں میں ان کے انگریز مخالف رویوں اور تحریک آزادی میں ان کی جدوجہد کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ انکشاف بھی سامنے آیا کہ دس سال سے کم عمر میں ہی ان کا نام مدرسہ سے محض اس لیے کٹوا دیا گیا تھا کہ علاقہ کے ایک انگریز پرست عالم دین کو یہ بات پسند نہیں آئی کہ بچپن سے ان کے دماغ میں انگریزوں کے خلاف رجحان پرورش پانے لگے، لہٰذا وہ گھر سے بھاگ کر مدرسہ جامع العلوم مظفر پور پہنچے۔ جہاں کچھ عرصے بعد ان کے انگریز مخالف رویہ سے اساتذہ کے علاوہ سینئر طلبہ بھی ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ مدرسہ عزیزیہ بہار شریف میں داخلہ کے ساتھ وہ خلافت تحریک کی حمایت اور لیگ کی مخالفت میں کھل کر سامنے آگئے۔ بہار شریف کا پورا زمانہ انہیں سیاسی ہنگامہ آرائیوں کی نذر ہو گیا۔ پھر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی دیوبندی اور عزیز الرحمٰن لدھیانوی جب مشعل آزادی لے کر پٹنہ پہنچے تو ان کی حمایت کے ''جرم'' میں انہیں بھی گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں داخلے کے ساتھ انہیں ایک دوسری دنیا سے سابقہ پڑا۔ جوان کے تحریکی مزاج اور انقلابی ذہن سے پوری طرح ہم آہنگ تھا۔ چنانچہ اردو کا پرچم بلند رکھنے کے ساتھ وہ 1942ء کے بھارت چھوڑو آندولن میں بھی کود پڑے اور ہر وہ طریقہ کار اختیار کیا جس کا تحریک آزادی مطالبہ کر رہی تھی۔ اس تعلق سے بیتاب صدیقی کا یہ پہلو ہماری نگاہوں سے مخفی ہے اور افسوس کہ مجاہدین آزادی کے تاریخ و تذکرے میں ان کا کوئی نام و نشان نہیں ملتا، البتہ ان کے ایک مضمون ''جنگ آزادی میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے اساتذہ و طلبہ کا کردار'' مطبوعہ 'الشّمس' پٹنہ 1988ء پر نظر پڑی۔ مذکورہ تحریر کے ایک حصے میں جنگ آزادی میں مدرسہ ہذا کے اساتذہ و طلبہ کے کردار کا ذکر ہے، دوسرے میں ایک مجاہد آزادی کی حیثیت سے خود ان کے کارناموں پر روشنی پڑتی ہے، جب کہ اختتامی

پیراگرافوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس عمر میں بھی قومی سطح کے رہنماؤں اور صف اوّل کے مجاہدین کے روبرو انہیں کس اعتماد سے اپنی بات رکھنے کا سلیقہ تھا۔ بحیثیت مجموعی یہ مضمون ان کی ایک مختصر خودنوشت ہے، جس سے جنگ آزادی میں ان کے کردار کی ایک جھلک سامنے آتی ہے۔ ذیل میں اسے نقل کیا جاتا ہے جو ہماری معلومات میں اضافہ کا موجب بھی ہے:

''مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ کا قیام جناب سید نورالہدیٰ کے ذریعے 1912ء میں عمل میں آیا۔ وہ باوجود یہ کہ انگریزی حکومت کی مشنری کے ایک کردار تھے اور ان کا ماحول بھی وہی تھا جس دور میں مذہبی تعلیم کو معیوب سمجھا جانے لگا تھا اور مسلمانوں کا خوشحال طبقہ اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم دلانا ضروری سمجھتا تھا۔ ایسے ماحول میں بانی مدرسہ کے ذہن و دماغ میں مذہبی تعلیم کی اہمیت اور اس کے لیے ایک ادارہ کا قیام یقیناً ان کی مذہبی روشن خیالی کا ایک ثبوت ہے۔ اسی دور میں پوری (اڑیسہ) میں ایک سنسکرت کالج کا قیام انگریزی حکومت کے ذریعہ عمل میں آیا اور اس کے بدلے مدرسہ عالیہ کلکتہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے فوراً بعد مظفرپور میں ایک سناتن دھرم سماج سنسکرت کالج سرکاری سطح پر قائم ہوا۔ انگریزی حکومت بہار میں بھی ایک سرکاری مدرسہ قائم کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ موجودہ انجینئرنگ کالج، پٹنہ جو ڈچ بلڈنگ کے نام سے موسوم تھا اسی میں حکومت نے اعلیٰ معیار پر ایک سرکاری مدرسہ قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ جناب سید نورالہدیٰ نے اس منصوبہ کے لیے ڈائرکٹر، محکمہ تعلیم کو مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ دینے کی پیش کش کی۔ مگر شرط یہ تھی کہ مدرسہ جہاں قائم ہے وہیں رہے۔ چنانچہ انگریزی حکومت نے غور وفکر کے بعد جج صاحب کی اس پیشکش کو قبول کرلیا اور شیش محل کا وہ دینی مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کی شکل میں سرکاری سطح پر آگیا۔ حکومت نے اس کے لیے ایک نصاب مرتب کرایا اور پورے پندرہ سال کی مدتِ تعلیم (جو جدید نصاب کے مطابق 17 سال ہوگئی ہے) پر مبنی ایک سرکاری مذہبی ادارہ قائم ہوگیا۔ تعلیم کی نگرانی حکومت بہار کے محکمہ تعلیم کے ذمے قرار پائی اور گورننگ باڈی کی تشکیل ہوئی۔ جس کے چیئرمین کمشنر پٹنہ ڈویژن بنائے گئے اور ایکس اوفیشیو ممبر کی حیثیت سے مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ ٹرسٹ کے متولی بھی اس میں شریک کیے گئے۔

مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ اس میں کوئی شک نہیں کہ سرکاری تعلیمی ادارہ کی حیثیت سے

اعلیٰ معیار پر آیا لیکن اس کے اساتذہ زیادہ تر دیوبند کے سند یافتہ لوگوں میں تھے۔ کچھ لوگ مولانا فضل حق خیرآبادی کے تربیت یافتہ تھے اور کچھ بریلی کے سند یافتہ حضرات بھی معلم کی حیثیت سے مدرسہ شمس الہدیٰ میں آئے۔ یہ اساتذہ انگریزی ملازمت میں رہنے کے باوجود ذہنی طور پر روشن خیال تھے اور علمائے سلف کی راہ پر چلنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ایسے لوگوں میں مولانا محمد سہول صاحب عثمانی، مولانا عبید اللہ صاحب، مولانا عبد الشکور صاحب آہ مظفرپوری، جو مولانا اصغر صاحب کے بعد پرنسپل ہوئے۔ اس طرح مولانا عبدالرحمٰن اور مولانا دیانت حسین صاحب بڑے ہی آزاد خیال اور آزادی کی تحریک سے گہری دلچسپی رکھنے والے تھے۔ یہ حضرات تحریک آزادی میں حصہ لینے والے طلبہ کی درپردہ حوصلہ افزائی کرتے تھے اور درسگاہ میں بھی طلبہ کو جنگ آزادی میں شریک علما کے موقف سے آگاہ کرتے تھے۔ مولانا عبدالصمد صاحب تو مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ میں مدرس ہونے سے پہلے 1937ء کے عام انتخاب میں کانگریس کے سرگرم دلیر اور جاں باز رہنما پروفیسر عبدالباری کے انتخاب میں حصہ لے چکے تھے اور کچھ دنوں تک کانگریس کے پبلسٹی رورل ڈیولپمنٹ محکمہ کے ایک اسٹاف کی حیثیت سے کانگریس کے ترقیاتی منصوبوں میں شامل تھے۔ 1936ء میں جب میں پٹنہ آیا تو یہاں کے آزاد خیال اور جنگ آزادی میں حصہ لینے والے رہنماؤں سے میری ملاقات ہوئی۔ اس وقت پنڈت جواہر لال نہرو کی قائم کردہ مسلم ماس کونٹیکٹ کمپین کا پرجوش طور پر بہار میں کام ہو رہا تھا۔ جناب منظر رضوی صاحب تحریک کے ذمہ دار تھے۔ مسلم ماس کونٹیکٹ کمپین کے صدر پروفیسر عبدالباری تھے۔ ان دونوں آدمیوں سے میں بہت جلد گھل مل گیا۔ اسی زمانے میں مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی قائم ہوئی۔ جس کے سرگرم رہنما اور بانی ابوالمحاسن حضرت مولانا سجاد تھے اور پارٹی کے صدر جناب یونس صاحب بارایٹ لاء تھے۔ 1935ء کے سیاسی اصلاحات کے ایکٹ کی روشنی میں ایک عام جداگانہ انتخاب کا اعلان ہوا۔ حضرت مولانا سجاد علیہ الرحمہ کی رہنمائی میں انڈیپنڈنٹ پارٹی نے اپنے امیدوار کھڑا کیے اور یہاں مسلم لیگ کو امیدوار کھڑا کرنے کا موقع نہیں دیا۔ انڈیپنڈنٹ پارٹی کی سرگرمیوں میں میرے ساتھ اور مدرسہ اسلامیہ کے طلبہ نے بھی خوب سرگرم حصہ لیا۔ یہاں تک کہ انڈیپنڈنٹ پارٹی کو کامیابی ہوئی اور سیاسی حالات کے بموجب کانگریس نے ابتدا

میں دفتروں میں جانا پسند نہیں کیا۔ اس لیے انڈ پینڈنٹ پارٹی نے حکومت بنائی جس کے وزیراعظم یونس صاحب بارایٹ لاء منتخب ہوئے۔ 1935ء کے بموجب ریاستی حکمراں پارٹی لیڈر کو اس وقت وزیراعظم کہا جاتا تھا جو 1946ء کے بعد میں وزیراعلیٰ کہلائے۔

مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ میں تحریک آزادی کے ہمدرد اور ذہنی طور پر آزادی پسند طلبہ کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ ان طلبہ میں طاہر عثمان صاحب، عبدالخالق ٹکٹکی، منظور مجاہد، مظفر نواب، ابوالحیات، قاری صلاح الدین صاحب، مختار الدین آرزو (صاحب زادہ مولانا ظفر الدین صاحب بہاری)، مولانا عبدالمجید رحمانی متوار پور، سمستی پور خورد، مولانا حسین احمد نیازی، وہاج الدین اعظمی اور جناب مولوی اسرار الحق قیس یہ سب آزادی کے بڑے سرگرم طلبہ میں تھے۔ قاضی رئیس اگرچہ بہت خاموش طالب علم تھے مگر جدوجہد آزادی میں ہماری آواز میں آواز ملاتے تھے۔ یہاں کے کچھ طلبہ طبیہ کالج میں داخل ہوگئے تھے، وہ بھی ہم لوگوں کے ساتھ سرگرم عمل ہی رہتے تھے۔ جناب مولوی اسرار الحق صاحب چونکہ حکیم اسرار الحق پروفیسر طبیہ کالج کی حیثیت سے اب سبکدوش ہو چکے ہیں ان کے والد محترم کوآپریٹو بینک میں ہیڈ کلرک تھے اور جمال روڈ میں رہتے تھے۔ ہم لوگوں کی زبردست ہم نوائی کرتے تھے۔ چنانچہ 1942ء کی تحریک میں مدرسہ شمس الہدیٰ کا ہاسٹل خالی کرادیا گیا تو مولوی اسرار الحق صاحب کے والد محترم یوسف صاحب مرحوم نے اپنے یہاں مجھے پناہ دی۔

1942ء کی تحریک میں مہاتما گاندھی نے اپنی گرفتاری سے قبل 9 اگست 1942ء کو انگریز بھارت چھوڑو کی تجویز کے ساتھ 'کرو یا مرو' کا نعرہ دیا تو پٹنہ میں بھی طلبہ میں بہت جوش وخروش پیدا ہوگیا اور سب سے پہلے مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے طلبہ نے پٹنہ کالج کے سامنے ٹیلی فون کا تار توڑ کر گرادیا اور تحریک کے دوسرے دن وفا براہی، مشہور شاعر کے ساتھ مہندرو ڈاکخانہ میں آگ لگانے میں بھی ہم لوگ پیش پیش تھے۔

مولانا اصغر حسین صاحب، مولانا عبدالشکور آہ صاحب اور مولانا حافظ عبدالرحمٰن صاحب اس وقت ہم آزادی پسند طلبہ کے زبردست حمایتی اساتذہ میں تھے۔ میں مختلف سرگرمیوں میں مصروف رہتا تھا اور دو ڈھائی بجے شب واپس آتا تھا۔ مولانا عبدالشکور صاحب اس وقت میرے انتظار میں جاگتے رہتے تھے۔ قاضی رئیس صاحب جو ان کے بغل میں مسجد میں

رہتے تھے ان کو بار بار بھیجتے کہ دیکھو بیتاب صدیقی آیا کہ نہیں، جب میں ہاسٹل میں جاتا تو قاضی رئیس مجھے لے جا کر مولانا کے سامنے کھڑا کر دیتے، مولانا شفقت بھری نگاہوں سے دیکھ کر پوچھتے کہ خیریت سے آگئے؟ اچھا جاؤ آرام کرو، پھر وہ سو جاتے۔ مولانا اصغر صاحب بھی ہمارے بڑے مداح اور خیرخواہ تھے اور درپردہ مددگاروں میں تھے۔ کسی طرح 1942ء کی تحریک میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے طلبہ کی سرگرمیوں کی خبر حکومت کو ہوگئی اور حکومت نے ہاسٹل خالی کرادیا۔ ہاسٹل میں کچھ دنوں تک ''ٹومی'' (انگریزی فوج) رہے۔

1942ء کی تحریک 9 اگست سے 12-11 اگست تک بہت پرجوش طور پر چلتی رہی اور 11 کو پٹنہ سکریٹریٹ میں قومی جھنڈا لہرانے کے سلسلے میں طلبہ پر جو فائرنگ ہوئی اس کے بعد تحریک نے درپردہ تخریبی صورت اختیار کرلی۔ انگریزی فوج جب پٹنہ میں آئی تو اس نے پورے شہر کا خاردار تاروں کے ذریعہ محاصرہ کرلیا جس سے نکلنا بہت مشکل تھا، لیکن ہم لوگوں نے مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے قریب افضل پور محلّہ سے لے کر جمال روڈ اور اسٹیشن تک گلی گلی راستہ بنالیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں اکزبیشن روڈ 'فردوس منزل' کی مشرقی دیوار کو توڑ کر ہم لوگوں نے ایک راستہ بنالیا جو بھٹا چاریہ روڈ میں نکلتا تھا۔ ایک روز میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ سے پورب مہندرو بھٹی سے نچلی سڑک کو گڈھا کھود کر فوجیوں کے لیے ناقابل آمد ورفت بنانے میں مصروف تھا، اس دن مدرسہ کے ہمارے ایک اور ساتھی دوسرے پروگراموں میں لگے ہوئے تھے۔ وہاں پر محلے کے لوگ میرے ساتھ تھے۔ میں نیچے گڈھا کھودنے میں مصروف تھا کہ اچانک فوجیوں کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ ہمارے ساتھی فرار ہو چکے ہیں اور بندوق بردار ہندوستانی اور گورکھا ملیٹری قریب آچکی ہے۔ پھر میں نے بھاگنا مناسب نہیں سمجھا کہ مبادا فائر نہ کردے اور میں نے بلند آواز سے یہ نعرہ لگایا ''پولس ہمارا بھائی ہے، انقلاب زندہ باد'' ہمیں یہ احساس تھا کہ شاید وہ گرفتار کرلے گی، لیکن یہ کہتے ہوئے گزر گئی کہ ''جلدی جلدی اپنا کام کرو''۔ اب یہ آواز سن کر فراری ساتھی بھی آموجود ہوئے۔ اس روز ہمیں یقین ہوگیا کہ ہندوستان کی آزادی کی منزل اب بہت قریب آچکی ہے۔ اس لیے کہ ہندوستان ملیٹری اور فوجی بھی آزادی کی تحریک کے خاموش ہمدرد اور ہمنوا ہیں۔

دوسرا ایک اور دلچسپ واقعہ یہ پیش آیا کہ 1942ء کی تحریک کے زمانے میں سب لوگوں نے گاندھی ٹوپی اپنے سر سے اتار دیا تھا۔ پٹنہ میں میرے اور کدم کنواں کے سنگھیشور پرساد وکیل کے سر پر گاندھی ٹوپی ہمیشہ نظر آتی تھی۔ 13/14 راگست کو میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ سے ایک پاس لے کر شہر سے باہر جانا چاہتا تھا۔ بہار بینک کے قریب پُل پر فوجی رکاوٹ کھڑی کی گئی تھی اور ٹومی پہریداری کرتے تھے۔ ان کی مدد کے لیے ہندوستانی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یا کمشنر کے دفتر کے اسٹاف بھی رہتے تھے۔ چنانچہ ٹومی نے میرے سر پر گاندھی ٹوپی جیسے ہی دیکھا بندوق کے کندے سے حملہ کرنے کے لیے لپکا، مگر اس وقت کمشنر کے ایک اسٹاف جناب ظفر الحسن ملک نے فوراً مداخلت کی اور اس کو روکا۔ ٹومی نے کہا: This Cap? تو ظفر الحسن ملک صاحب نے جواب دیا کہ This is Maulana Ajmal Cap۔ وہ ٹومی کچھ سوچنے لگا پھر مجھے صحیح سلامت جانے کی اجازت دے دی۔

1942ء کی تحریک کا اثر پورے بہار میں ہی نہیں ملک بھر میں تھا اور مسلمان اس تحریک میں اچھی خاصی تعداد میں حصہ لے رہے تھے۔ پٹنہ میں طلبہ پر مسلم لیگ کی تحریک کا اثر بڑھنے لگا تھا، لیکن مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے اندر کانگریسی ذہنیت کے طلبہ کی تعداد زیادہ تھی۔ جب کوئی جلوس نکلتا تو مدرسہ کے اندر آتا اور طلبہ سے اپیل کرتا کہ ساتھیو ساتھ دو اور پھر ہم طلبہ پروانہ وار جلوس کے ساتھ شریک ہو جاتے۔

مولانا شاہ مبین الدین ندوی صاحب اور مولانا اصغر صاحب پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ ہم آزادی پسند طلبہ کی بڑی حوصلہ افزائی فرماتے تھے اور خاص خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ موصوف کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے میں 1945ء تک مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کی ''جمعیۃ الطلباء'' کا سکریٹری منتخب ہوتا رہا۔ 1945ء میں، میں نے فاضل کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور پھر مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ سے تدریسی سلسلہ منقطع ہو گیا اور میرے آزادی پسند رفقا کار بھی وہاں سے باہر نکل آئے۔ اس موقع پر ایک اہم واقعہ کا ذکر کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں کہ 1938ء میں بہار کے وزیر تعلیم ڈاکٹر سید محمود صاحب تھے۔ جو اینگلو سنسکرت کے قریب ہی دھرہرا کوٹھی میں رہتے تھے۔ مولانا آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو دونوں کانگریسی رہنما انڈین کانگریس کمیٹی یا ہندوستان کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت کے لیے تشریف

لائے تھے۔ دونوں حضرات ڈاکٹر سید محمود صاحب کے یہاں مقیم تھے۔ ہم لوگ مولانا آزاد سے ملنے کے لیے ڈاکٹر سید محمود صاحب کی کوٹھی میں پہنچے۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کے بعد وہیں برآمدے میں ایک نیوار کی چٹائی پر پنڈت جواہر لال نہرو سے ملاقات کے انتظار میں بیٹھ گے۔ جب وہ تشریف لائے تو میں نے آداب کیا اور وہ ہاتھ ملاتے ہوئے اس چٹائی پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ تو ایک سرکاری مدرسہ ہے تو اس کے سارے طلبہ واساتذہ بڑے رری ایکشنری ہوں گے؟ میں نے جواب دیا کہ نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ وہاں بھی کافی تعداد میں آزادی پسند طلبہ اور اساتذہ موجود ہیں۔ تو پنڈت جی میرا منہ دیکھنے لگے۔ میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں آپ کے قائم کردہ مسلم ماس کونٹیکٹ کمپین کا ایک رکن بھی ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ میں آزادی کے متوالوں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ اسی دوران مولانا ابوالکلام آزاد نے جو کھانے پر بیٹھ چکے تھے، پنڈت جی کو پکارا کہ او پنڈت! میری آنتوں میں مروڑ ہو رہی ہے۔ سخت بھوک لگی ہے۔ جلد آؤ، پنڈت جی میرا ہاتھ پکڑے ہوئے کھانے کے ٹیبل پر پہنچ گئے اور مجھے بھی کھانے میں شریک کر لیا۔ پھر مولانا ابوالکلام آزاد سے مخاطب ہوئے اور بڑے مسرت بھرے لہجے میں کہنے لگے کہ یہاں کے مدرسے میں رری ایکشنری مولوی بہت کم ہیں۔ بلکہ آزادی پسند لوگ ہیں۔ تو مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی میرے بیان کی تصدیق کی کہ بچے نے ٹھیک کہا۔ اس مدرسہ میں بھی علمائے سلف کے طریقے پر چلنے والے اساتذہ ہیں اور وہ سب لوگ آزادی کے کٹر ہمنوا ہیں۔ پنڈت جی نے بڑی مسرت سے میری طرف دیکھا اور کھانے کے لیے کباب پر ہاتھ بڑھایا۔ میں نے بھی ان کی تقلید میں زیادہ تر کباب ہی پر ہاتھ صاف کیا۔''

بیتاب صدیقی اور اردو تحریک

بہار کی اردو تحریک میں بیتاب صدیقی کی اساسی حیثیت، ان کے قائدانہ کردار اور کارناموں پر روشنی ڈالنے سے پہلے چند امور کی وضاحت شاید بیجا نہ ہو۔

بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے قیام (1951ء) سے پہلے بہار میں مرکزی انجمن ترقی اردو تحریک کے بجائے ایک تنظیم کی شکل میں اپنے وجود کی بقا کے لیے آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔

''اگر چہ سہیل عظیم آبادی انجمن ترقی اردو کے نقیب و ترجمان کی حیثیت سے مولوی عبدالحق صاحب کی زیر ہدایت حصول آزادی کے وقت تک چھوٹا ناگپور میں اردو کی اشاعت و تعلیم کا کام کرتے رہے۔ وہ تقریباً ایک جگ اس کام میں لگے رہے۔ اردو کی تعلیم و ترویج کا کتنا کام اس علاقہ میں ہوسکا اس کا مجھے اندازہ نہیں لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اپنی عمر کا بہترین حصہ انہوں نے وہاں اس کام میں لگایا، اس عرصہ میں وہ افسانہ نویسی بھی کرتے رہے اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے ذریعہ اپنے تعلقات اور دوستوں کے حلقہ کو وسیع تر بھی کرتے گئے۔''

(تقی رحیم: زبان و ادب، پٹنہ جنوری تا اپریل-1981ء ص:149)

''چونکہ آزادی سے پہلے اور لگ بھگ تین سال بعد بہار ایک صوبہ تھا۔ بہار صوبائی انجمن ترقی اردو یہاں چل رہی تھی...... سہیل صاحب اس انجمن کے رکن تھے۔ مگر یہ انجمن اس صدی کے نصف پر جاں بلب تھی۔ چنانچہ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے قیام کے ساتھ ہی روزِ اوّل سے سہیل صاحب نے صوبائی انجمن سے علاحدگی اختیار کر لی............ شروع کے پندرہ برسوں تک مسلسل سہیل بھائی ریاستی انجمن کے رکن کی حیثیت سے منسلک رہے''۔

(مقالاتِ غلام سرور-1983ء ص:22-21)

''پٹنہ سے 'نوجوان' ہفتہ وار شائع ہوتا تھا اس کے لکھنے والوں کا ایک گروہ تیار ہوا، جو 'حلقہ احباب نوجوان' کے نام سے یاد کیا جانے لگا اور پھر ایک نئی انجمن کی شکل اختیار کر گیا۔ جس کا نام 'حلقہ ادب' بہار رکھا گیا۔ اس میں ...... نوجوانان عظیم آباد تھے جو حلقہ ادب بہار، انجمن ترقی پسند مصنفین، دائرہ ادب، بزم سخن، بزم ادب اور بزم اردو کے ذریعہ شمع اردو روشن کیے تھے...... حلقہ ادب بہار کے زیر اہتمام وھیلر سنٹ ہال میں بہار کے شعرائے کرام کا تمثیلی مشاعرہ ہوا تھا۔ کانفرنسوں، مشاعروں اور ادبی محفلوں کا سلسلہ شد و مد کے ساتھ 1948ء سے 1951ء تک جاری رہا...... قاضی محمد سعید اس وقت صوبائی انجمن ترقی اردو بہار کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے اردو کی خدمت کر رہے تھے۔ 1951ء کے جون میں بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کا قیام عمل میں آیا...... یہیں سے عظیم آباد کی ادبی و لسانی سرگرمیوں کے دور دیگر کا آغاز ہوتا ہے۔''

(ایضا:ص:51, 53, 57)

مذکورہ اقتباسات کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ جس زمانہ میں سہیل عظیم آبادی چھوٹا ناگپور میں اور غلام سرور کے ''حلقہ احباب نوجوان'' بہار سمیت دیگر تنظیمیں اور ادارے سرزمین عظیم آباد میں اردو کی ترقی و ترویج میں سرگرم تھیں۔ 45-1940ء کے عرصے میں بیتاب صدیقی مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ کے ''جمعیۃ الطلباء'' کے سکریٹری تھے جس کی ادبی سرگرمیاں مدرسہ اور اس سے باہر جاری تھیں، اس سے بھی پہلے وہ 'بزم ادب' کی بنیاد رکھنے کے علاوہ 'اردو سکھاؤ' مہم کا آغاز کر چکے تھے۔ جس میں انہیں ڈاکٹر سید محمود، شاہ محمد زہیر، عبدالقیوم انصاری، شاہ مشتاق احمد، حافظ شمس الدین شمس منیری، جعفر امام، مظہر امام، محمد ایوب ایڈووکیٹ، نعیمہ حیدر، عزیزہ نقی امام، لیڈی انیس امام وغیرہ جیسی مقتدر ہستیوں کا تعاون حاصل تھا۔ غلام سرور (ولادت 1926ء) بیتاب صدیقی سے عمر میں دس سال چھوٹے تھے۔ اس اعتبار سے بھی بیتاب صدیقی کو ان پر تقدم حاصل تھا۔ اسی دوران غلام سرور نے پٹنہ یونیورسٹی میں خاص اساتذہ و طلبہ کے درمیان غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی تھی اور ان کی تحریر و تقریر کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا تھا۔ کم عمری کے باوجود بلا کے ذہین تھے۔ چنانچہ (جن لوگوں کا نام درج کیا گیا ہے ان میں) بیشتر کے ذہن میں یہ 'خطرہ' محسوس ہونے لگا کہ کہیں غلام سرور ان کے حلقہ سے بغاوت نہ کر جائیں۔ اس وقت وہ لیگی تھے لہٰذا سبھوں کی یہ متفقہ رائے ہوئی کہ کسی طرح انہیں ساتھ لایا جائے۔ اس کام کے لیے بیتاب

صدیقی کو تیار کیا گیا، جن کی کوششوں سے وہ پورے دم خم کے ساتھ ایسا آئے کہ ان کے بزرگوں اور معاصرین نے قائد اردو کی حیثیت سے انہیں تسلیم کرلیا۔ بیتاب صدیقی اور غلام سرور کی باہمی رفاقت اور اردو کے پاسداروں کی بے لوث قربانیوں کے نتیجے میں بہار کے آسمانِ اردو پر تحریک کی ایسی گھٹا اٹھی جو دیکھتے دیکھتے پورے بہار پر برسی یہاں تک کہ اس کے زیرسائے آنے کے لیے دیگر کئی ریاستیں بھی اس کی تقلید کرنے لگیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے اس پرعزم، پرجوش اور باعمل قافلے میں بابائے اردو کی مرکزی انجمن کے لوگ بھی آئے، انجمن ترقی پسند مصنفین کے افراد بھی شامل ہوئے اور بہار کے علمائے دین شرح متین نے بھی اپنی رہنمائی کی سعادتیں بخشیں۔

مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ میں بیتاب صدیقی کی طالب علمی کے دور سے یہاں کے عمائدین شہر، دانشوران اور سیاسی ومذہبی قائدین کی اکثریت مختلف مکتبہ فکر ونظر سے تعلق رکھنے کے باوجود اردو کے آئینی حقوق کی بازیابی کے لیے فکرمند تھی۔ اسی کے ساتھ اس وقت کی مذہبی اور سیاسی صورتحال کو مثبت رخ دینے کے لیے یہی طبقہ متحرک وفعال تھا جن کا اثر ورسوخ عوام الناس میں بھی تھا اور ایوان حکومت میں بھی۔ چنانچہ سماج کے مختلف عقائد ونظریات اور مختلف شعبوں میں مخصوص صلاحیتوں کی حامل سرکردہ شخصیات کو اردو کے حق میں متحد اور مجتمع کر کے 13 تا 15 جون 1951ء انجمن اسلامیہ ہال، پٹنہ میں ایک عظیم الشان سہ روزہ اردو کانفرنس منعقد کی گئی۔ جس کا افتتاح اس وقت کے وزیر اعلیٰ بہار شری کرشن سنہا نے کیا، جو شاہ محمد زہیر ودیگر مسلم رہنماؤں کے توسط سے اردو کے آئینی حق اور اسے درپیش مسائل سے اچھی طرح واقف تھے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی، صدر شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے کانفرنس کی صدارت کی اور پہلی بار اس موقع پر اپنے مطبوعہ خطبہ صدارت میں دستور جمہوریہ ہند کی دفعہ 347 کی رو سے اردو کو بہار کی علاقائی زبان بنائے جانے کا مطالبہ بھی اسی مجلس میں رکھ دیا۔ کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کے چیئرمین عبدالقیوم انصاری، وزیر محکمہ تعمیرات عامہ بہار نے اپنے خطبہ استقبالیہ کا جب یہ جملہ پڑھا کہ:

''مسئلہ گئو زبان آزاد ہندوستان کے سامنے ہنوز حل طلب ہے اور ملکی، قومی ہمہ جہتی ترقی کے لیے ان کا حل ضروری ہے تو ان کی تائید میں حال کے اندر وباہر نعرہ تحسین وآفرین بلند کیا گیا''۔

(مقالاتِ غلام سرور ص:17)

اس کانفرنس میں انجمن ترقی اردو ہند کی جانب سے خیر بہوروی نے مرکزی انجمن کے نمائندہ

خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ تین دنوں تک اجلاس پر اجلاس ہوتے رہے تیسرے اور آخری دن ایک کل ہند مشاعرہ بھی ہوا۔ اس سے قبل دن کی ایک مجلس میں متفقہ طور پر جس انجمن کا وجود عمل میں آیا اس کا نام 'بہار ریاستی انجمن ترقی اردو' پڑا۔ انجمن کی تشکیل کے ساتھ اس کے عہدیداران کا انتخاب بھی عمل میں آیا۔ سردار محمد لطیف الرحمٰن ایم ایل اے انجمن کے صدر، غلام سرور جنرل سکریٹری اور بیتاب صدیقی جوائنٹ سکریٹری منتخب ہوئے۔ اس کے علاوہ ریاست کی سرکردہ شخصیتوں پر مشتمل ایک مجلس عاملہ بھی وجود میں آ گئی۔ غلام سرور نے 1954ء میں جب جنرل سکریٹری کے عہدے سے سبکدوشی حاصل کی اس کے بعد سے لے کر پھر کوئی ایسا دور نہیں گزرا کہ بیتاب صدیقی انجمن کے جنرل سکریٹری یا صدر نشیں نہ رہے ہوں۔ ایمرجنسی کے زمانے میں انجمن دوحصوں میں تقسیم ہوگئی تو وہ بنیادی انجمن کے ساتھ رہے۔ موصوف ریاستی انجمن ترقی اردو کی تاسیس سے ہی اسے فعال اور متحرک رکھنے اور اس کی توسیع کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ انجمن میں بیشتر سرکردہ شخصیتوں کو لانے میں ان کی مساعی جمیلہ کا بڑا عمل دخل تھا۔ شاہ مشتاق احمد سے ان کی قربت کی داستان پرانی ہے۔ بقول پروفیسر عبدالمغنی:

''مولانا بیتاب صدیقی صاحب کے ساتھ شاہ مشتاق احمد صاحب کی دوستی بہت گہری تھی۔ وہ دونوں پٹنہ کے قلب، مرادپور میں اکثر ساتھ ساتھ دیکھے جاتے تھے۔ یہ جوڑی اتنی مشہور ہوئی کہ بعض نکتہ سنجوں اور ظریفوں نے غالب کے ایک شعر میں اس طرح تحریف کی:

اک ہیں مشتاق، دوسرے بیتاب
یا الٰہی، یہ ماجرا کیا ہے؟

عظیم آباد کے زندہ دلوں کی ٹولیاں مرادپور کے بازاروں، ہوٹلوں اور کوچوں میں گشت کرتی رہتی تھیں۔ انہیں کے درمیان شاہ صاحب اور بیتاب صدیقی اکثر ساتھ ساتھ نظر آتے تھے۔''

(ندائے پاسدار، پٹنہ، جنوری تا مارچ 2007ء ص:57)

شاہ مشتاق احمد اگرچہ شروع سے غلام سرور کی شخصیت کے معترف اور ان کی غیر معمولی صلاحیتوں سے متاثر تھے، لیکن دونوں کی سیاسی دھارائیں دوسمتوں میں بہتی تھیں۔ ایک خاندانی اور پکے کانگریسی، دوسرے کانگریس کے زبردست مخالف، لیکن قومی، ملی ولسانی مفاد میں شاہ مشتاق احمد نے نہ صرف یہ کہ انجمن کی رکنیت قبول کی بلکہ 1965ء میں وہ اس کے خازن اور 1968ء میں صدر نشیں ہوئے۔ انہیں انجمن کی دہلیز تک لانے میں بیتاب صدیقی کی گرانقدر خدمات کو مسترد نہیں کیا جاسکتا ہے۔

بیتاب صدیقی 1945ء میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ سے فراغت حاصل کر چکے تھے۔ ابتدائی کچھ برسوں تک وہ مدرسہ میں عارضی معلم بھی رہے۔ 1948ء میں عبدالمغنی نے وہاں داخلہ لیا، ان کا قیام مدرسہ کے شیش محل ہاسٹل میں تھا۔ وہ ایک ذہین، باصلاحیت اور پرجوش طالب علم تھے۔ اردو کی تحریکی سرگرمیوں سے مزید قریب کرنے میں بیتاب صدیقی یقیناً ایک محرک رہے، وہ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ کے رکن اور آفس سکریٹری بھی رہے۔ اس حیثیت سے اردو تحریک اور اس کے ترجمان 'سنگم'، پٹنہ کو جاری رکھنے میں ان کی عظیم الشان خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ انجمن کے قیام سے لے کر اس کے سقوط تک انجمن کے شانہ بشانہ رہے۔ انجمن کے میمورنڈم، عرضداشت، خبریں اور لٹریچر تیار کرنے میں ان کے کارہائے نمایاں آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔ پروفیسر احسان اشرف، رام موہن رائے سیمنری پٹنہ میں بیتاب صدیقی کے شاگردوں میں تھے۔ طالب علمی کے دور سے تحریکی مزاج رکھتے تھے۔ ان کا شمار ابھی بھی دم توڑتی انجمن کے ایک انتہائی فعال اور سرگرم رکن میں ہوتا ہے۔ سال 1973ء میں بیتاب صدیقی کی علالت کے دور میں وہ انجمن کے قائم مقام جنرل سکریٹری ہوئے اور ان کی رہائش گاہ 'بیت الوارث' ریاستی انجمن کا صدر دفتر رہا۔ رام موہن رائے سیمنری کے پرنسپل کے. کے. پودار اور ان کے والد بیتاب صدیقی کے کرم فرماؤں اور اردو دوستوں میں تھے۔ پرنسپل کے. کے. پودار ریاستی انجمن کی مجلس عاملہ کے رکن بھی رہے۔ بعد میں وہ پروفیسر عبدالمغنی کی انجمن ترقی اردو کے ساتھ ہو گئے۔ 'ہفتہ وار بلٹز'، بمبئی کے بیورو چیف اور صحافی ریاض عظیم آبادی کو انجمن کی رکنیت بیتاب صدیقی کے ہاتھوں ہی ملی تھی۔

ایک قلیل عرصہ میں ریاستی انجمن ترقی اردو بہار، ریاست کے علاوہ ملک بھر میں اردو کا سب سے اہم پلیٹ فارم، فعال تحریک اور مؤثر آواز بن گئی۔ یہاں تک کہ ایک ریاستی انجمن کو مرکزی انجمن کی حیثیت سے لوگوں نے اس کی قیادت کو تسلیم کیا۔

بہار میں اردو تحریک کے مختلف ادوار کا ذکر کرتے ہوئے بیتاب صدیقی کہتے ہیں:

''کہنے کو تو میں بھی بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے بانیان میں تھا اور پھر اس کے جوائنٹ سکریٹری، جنرل سکریٹری سے لے کر صدر تک کے عہدوں پر رہا، لیکن ہر دور میں انجمن کے دیگر ذمہ داران و ہمدردان، بوڑھوں اور نوجوانوں نے جیسی انتھک محنت اور بے لوث خدمت انجام دی ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ نہ میں نے کسی دوسرے ادارے یا تحریک میں دیکھی، لوگوں

نے اپنا تن من دھن، اپنی صحت، جائداد، آرام سب کچھ اردو تحریک کے لیے جھونک دیا تھا۔ یہاں تک کہ بیوی، بال بچوں کی کیا ضروریات ہیں وہ کیا کھائیں گے، کہاں رہیں گے، ان کے علاج ومعالجہ اور تعلیم وتربیت سے بے نیاز بس انجمن کی دھن میں لگے تھے۔ انجمن کے ابتدائی دور سے لے کر ایمرجنسی تک میں بڑے بڑے نشیب وفراز دیکھے، لیکن لوگوں کا جوش تھمنے کا نام نہیں لیتا۔ انہیں کی جانفشانی کا نتیجہ تھا کہ ہم لوگوں نے انجمن کو خاص کی تحریک بنانے کے بجائے عوام الناس کی تحریک بنایا جس کے ثمر آور نتائج بھی برآمد ہوئے۔''

انجمن کی دستخطی مہم:

اردو کے تحفظ وبقا اور اس کے آئینی حقوق کی بازیابی کے لیے جنوری 1952ء سے ریاست گیر سطح پر دستخطی مہم کی شروعات ہوئی۔ بیتاب صدیقی 1956ء تک انجمن کے صدر جنرل سکریٹری منتخب ہو چکے تھے اور ان کی قیادت میں پورے بہار میں اردو دستخطی مہم زور شور پر تھی۔ بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے اور اس کے سات مخصوص مقاصد کے استعمال کے لیے سوا نو لاکھ دستخطوں پر مشتمل ایک عرضداشت غلام سرور کی سکریٹری شپ، بیتاب صدیقی کی رہنمائی اور لیڈی انیس امام کی قیادت میں ایک اعلیٰ سطحی وفد نے 24 فروری 1956ء کو صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرساد کی خدمت میں پیش کی گئی۔ جس پر انہوں نے مثبت کاروائی کی یقین دہانی بھی کرائی۔ وفد کی قیادت لیڈی انیس امام نے کی تھی۔

مردم شماری میں اردو کا اندراج:

دستخطی مہم کے بعد اردو کے مسئلے پر انجمن کی دوسری سب سے اہم تحریک 71-1961ء کی مردم شماری میں اردو مادری زبان کا مردم شماری کے فارم میں اندراج تھا، چنانچہ رائے عامہ بیدار کرنے کے لیے یکم جون 1960ء کو چھوٹا ناگپور میں اردو کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس کے چھ ماہ کے اندر مظفر پور میں دوروزہ اردو کانفرنس (3۔4 دسمبر 1960ء) ہوئی تا کہ مردم شماری کے موقع پر مادری زبان اردو کا زیادہ سے زیادہ اندراج ہو سکے۔ مہم کی کامیابی کے لیے بیتاب صدیقی، غلام سرور اور محمد ایوب ایڈووکیٹ کے علاوہ دیگر قائدین نے ریاست کے گوشے گوشے کا دورہ کرنے کے علاوہ ملک کی دوسری ریاستوں کا بھی سفر کیا۔ 1971ء کی مردم شماری میں بھی انجمن مستعد رہی، جس کے سبب دونوں مردم شماری میں اردو زبان والوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔

اردو کو الیکشن ایشو بنانے کی مہم:

بیتاب صدیقی زمینی طور پر اردو تحریک کا زبردست تجربہ رکھتے تھے۔ وہ انجمن کے معمر ترین لوگوں میں تھے۔ چنانچہ ان کا احساس تھا کہ:

"تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ کوئی بھی تحریک عوامی حمایت کے بغیر زیادہ دنوں تک چلنے کے بجائے اپنے پہلے یا دوسرے مرحلے میں ہی دم توڑ دیتی ہے۔ یہ صورتحال 1947ء سے قبل ہندوستان کی جنگ آزادی کی تحریک کے ساتھ بھی رہی کیونکہ جب اپنوں نے غداری کی یا سرد مہری دکھائی تو انگریزوں کو بھگانے کا خواب کیا شرمندۂ تعبیر ہوتا ان کا تسلط اور بڑھتا گیا اور جب پورے ملک میں کھیتوں اور کھلیانوں سے لے کر محلوں تک کے لوگ اپنے گھروں سے نکل آئے تو نتیجے میں ہندوستان کی آزادی میسر آئی۔ لہٰذا ماضی کے انہی تجربات کو دیکھتے ہوئے بہار میں اردو تحریک روزِ اوّل سے عوام کے ہاتھوں رہی جب کہ اتر پردیش میں خواص اور سامنتوں نے اردو تحریک کو آگے بڑھانے کے بجائے اس کا دم ہی نکال دیا۔ انجمن کی دستخطی مہم اور اس وقت کی آبادی کے اعتبار سے تقریباً دس لاکھ بالغوں کا دستخط یا ان کے انگوٹھے کا نشان کچھ معنی رکھتا ہے۔ اس مہم کے ذریعہ انجمن پٹنہ سے لے کر گاؤں، قصبوں، محلوں، ٹولوں، بستیوں، گلیوں اور کوچوں تک میں متعارف ہوگئی۔ 1961ء کی مردم شماری آتے آتے انجمن نے اپنے کارکنان کے توسط سے اردو داں اور اردو نواز طبقوں میں یہ شعور پیدا کر دیا کہ مادری زبان کے خانے میں اردو کا اندراج کرایا گیا۔ انجمن نے اس پر بھی راحت کی سانس لی نہ اطمینان سے بیٹھی، اس کے سرکردہ قائدین نے محسوس کیا کہ عوام الناس میں تو اس نے اپنی ساکھ بنالی، لیکن ارباب اقتدار ٹس سے مس نہیں ہوئے تو اس نے 1965ء میں بہار اردو کنونشن کا انعقاد کیا۔ اس کنونشن میں طے پایا کہ اگر دو سال کے اندر اس کے مطالبات نہیں تسلیم کئے گئے تو اگلے 1967ء کے پارلیمانی انتخاب میں اردو کو انتخابی ایشو بنایا جائے گا۔ فیصلہ تو ہوگیا لیکن یہ بڑی ٹیڑھی کھیر تھی۔ اس وقت غلام سرور صدر انجمن تھے۔ پھر کیا تھا ان کی قوت گویائی اور دن رات کی مشقت سے انجمن کے ہاتھوں پارلیمانی انتخاب میں کانگریسی امیدوار کیدار پانڈے کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔ غلام سرور کی تحریر "بہار میں اردو تحریک کے پچاس سال" مطبوعہ 1988ء جو کتابچہ کی شکل میں شائع

شدہ ہے اس سے میری باتوں کی تائید ہوتی ہے۔ انجمن کے قیام کے نو برسوں بعد جس زمانے میں، میں جنرل سکریٹری اور محمد ایوب ایڈووکیٹ صدر تھے، ایوب صاحب نے 1962ء میں ہی اردو کو الیکشن ایشو بنانے کی غرض سے وزیر اعلیٰ پنڈت بینودانند جھا کے خلاف راج محل حلقہ اسمبلی سے انتخاب لڑنے کا اعلان کر دیا تھا۔ جس سے بینودا جی کی رات کی نیند اور دن کا چین حرام ہوگیا۔ انہیں کسی طرح منانے اور انتخاب سے دور رکھنے کی کوششیں ہونے لگیں۔ حکومت نے ریاستی انجمن کے ایک اعلیٰ سطحی وفد کو مصالحت کے لیے مدعو کیا۔ جس کا فوری ردِ عمل یہ ہوا کہ اس وقت حکومت نے طلبہ کو امتحانات کی جوابی کاپیاں اردو میں لکھنے کے انجمن کے مطالبے کو تسلیم کرلیا۔ بقیہ مطالبات بھی اصولی طور پر مانتے ہوئے ان پر انتخاب کے بعد عمل درآمد کی یقین دہانی کرائی، لیکن اپنی ہی تھالی میں کھا کر چھید کرنے والوں کی کمی کسی زمانے میں نہ رہی ہے، نہ رہے گی۔ اس موقع پر بھی ایسا ہی ہوا۔ بینودانند جی تو زمانہ شناس تھے، مگر ابن الوقتوں اور چاپلوسوں کی چال میں پھنس کر انجمن سے کیے گئے وعدوں کو ٹال مٹول کرنے لگے تو انجمن نے بھی ان سے لوہا لینے کی ٹھان ہی لی اور فیصلہ ہوا کہ وزیر اعلیٰ کے انتہائی قریبی اور دست راست کیدار پانڈے کو ہی سبق سکھایا جائے۔ وہ رام نگر سے امیدوار تھے۔ انجمن کے عہدیداران اور رضا کاران وہاں پہنچے ہی میرے ساتھ غلام سرور بھی الیکشن سے دو دن پہلے تک ڈٹے رہے۔ پھر کیدار پانڈے کی مخالفت میں ایسی آندھی اٹھی کہ وہ الیکشن تو ہارے، ہی بینودانند جی پر بھی کم صدمہ نہ ٹوٹا۔ پھر کیا تھا 1967ء میں الیکشن کے موقع پر وہ دوڑے دوڑے سرور صاحب کے پاس آئے۔ انجمن نے ایک قرارداد تیار کیا۔ جس پر وہ دستخط بھی کر گئے۔ کیدار پانڈے کی شکست کے . بی. سہائے نے اَن دیکھی نہ کی۔ یہی وجہ تھی کہ 1971ء میں جھٹ سے انہوں نے اعتراف کرلیا کہ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے مطالبات سے چشم پوشی کر کے کانگریس سرکار نے ایک بڑی غلطی کی تھی۔ کیدار پانڈے کی شکست سے جہاں انجمن کا وقار بلند ہوا وہیں کانگریسی صفوں میں مایوسی اور آپا دھاپی مچ گئی۔ اس لیے اب سرکار جہاں کچھ دے دینے کے لیے مجبور ہو چکی تھی وہیں ہم اس سے بڑھ چڑھ کر لینے پر آمادہ تھے۔ چنانچہ 1980ء کے آتے آتے ہم نے حکومت کی ناک میں دم کر دیا۔ ملاقات، جلسے، جلوس، مظاہرے،

میمورنڈم، اخباری بیانات، 'سنگم' میں ادارے اور حکومت سے گفت وشنید کا سلسلہ جاری رہا۔
یہاں تک کہ سرکار نے بہار آفیشیل لنگویجیز ایکٹ میں ترمیم کر کے دستور کی دفعہ 345 کی
رو سے اردو کو بہار کی ثانوی زبان کا درجہ دے دیا گیا، جو دراصل 1951ء سے لے کر
1980ء تک کی مستقل جدوجہد اور لگاتار ابتلا وآزمائش کا ثمرہ تھا۔''

یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ بہار اسمبلی کے ایوان میں جس وقت قانونِ اردو کا بل پیش کیا گیا اور اس پر ووٹنگ کرائی گئی تو ایک بھی ہاتھ اردو کی مخالفت میں نہ اٹھا۔ 19 جنوری 1981ء کو ایک علامیہ جاری کیا گیا جس میں اردو کے سات مقاصد کے استعمال کی وضاحت کی گئی۔ اگرچہ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو نے حکومت کے اس اقدام کی ستائش کی، اس کے باوجود مذکورہ علامیہ کے تین نقائص اور خامیوں کا انکشاف بھی کیا:

(۱) اردو کے ساتھ اس کے رسم الخط کا ذکر نہیں ہے۔ جب کہ اس ایکٹ میں ہندی کے ساتھ اس کی لیپی کا ذکر ہے۔

(۲) ایکٹ میں تعلیم کا سرے سے ذکر نہیں ہے۔ جب کہ صدر جمہوریہ کو دیے گئے سات نکاتی میمورنڈم میں نمبر ایک پر ہی مادری زبان اردو اور اردو میں ابتدائی تعلیم کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

(۳) انجمن نے پوری ریاست کے لیے اردو کو ثانوی زبان کا درجہ دیے جانے کا مطالبہ کیا تھا جب کہ پہلے مرحلے میں پٹنہ کو چھوڑ کر بہار کے صرف پندرہ اضلاع میں نافذ کیا گیا۔ (البتہ بعد میں مرحلہ وار پورے بہار میں یہ نافذ العمل ہوا۔)

یہ حسن اتفاق ہے کہ چالیس سال قبل بہار ریاستی انجمن ترقی اردو نے صدر جمہوریہ ہند کے خدمت میں جو عرضداشت پیش کی تھی اس میں جن سات مقاصد کے لیے اردو کو آئینی اور ثانوی زبان کا درجہ دینے کا مطالبہ تھا اس میں پانچواں مندرجہ ذیل تھا:

''مجالس قانون سازیہ میں اردو داں اراکین کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ اپنی مادری زبان میں تقریر کر سکیں اور ایسی تقریروں کی رپورٹنگ اردو رسم الخط میں بھی کی جائے''۔

قدرت کو بھی کچھ عجب منظور تھا۔ غلام سرور جب 1990ء میں بہار قانون ساز اسمبلی کے اسپیکر ہوئے تو ڈاکٹر شکیل احمد (ایم ایل اے) کی ایک توجہ دلاؤ نوٹس پر 1991ء میں بہار قانون ساز اسمبلی کے ضابطہ نامہ، طریقہ کار و دستور العمل میں ضروری ترمیم کرتے ہوئے اردو کو اسمبلی کی زبان میں شامل کر کے

ایوان بالا سے بھی اس کی تصدیق کرالی، جون 1993ء میں باضابطہ اردو کا ایک شعبہ قائم ہوا جس میں اردو کے افسران و دیگر اسامیوں کی تقرری عمل میں آئی۔

یہ خوش آئند بات ہے کہ پروفیسر جابر حسین جب ایوان بالا کے صدر نشیں ہوئے تو انہوں نے بھی کونسل میں ایک مضبوط شعبہ اردو قائم کیا اور وہاں کئی اردو افسران سمیت متعدد عملوں کی تقرری عمل میں آئی۔ آزاد ہندوستان کی قانون سازیہ کی تاریخ میں یہ بھی پہلا موقع تھا جب دسمبر 1994ء میں بہار اسمبلی کے اجلاس میں اوقاف سے متعلق اسمبلی کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ ایوان میں اردو زبان میں پیش کی گئی۔

بیتاب صدیقی کے تحریکی دورے:

بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی تاسیس کے ساتھ انجمن نے ہر اس ادارے، تنظیم، کمیٹی اور فرد کے لیے اپنے دروازے کھلے رکھے تھے جو اردو کے عام مفاد میں اس کے ساتھ مل کر کام کرنے کا خواہشمند ہو یا جسے اردو کے فروغ و بقا کے لیے انجمن کا ساتھ چاہیے تھا چنانچہ ریاست بہار میں انجمن کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور مصروفیت کے باوجود دسمبر 1951ء کے آخر میں مرکزی انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری پروفیسر آل احمد سرور کی دعوت پر بیتاب صدیقی علی گڑھ تشریف لے گئے اور ان سے مختلف امور پر تبادلہ خیال کیا۔ نیز وہاں منعقدہ کئی نشستوں اور جلسوں میں شریک ہوئے۔ دسمبر 1951ء میں لکھنؤ میں اردو کنونشن میں اتر پردیش میں دستخطی مہم چلانے کے فیصلے میں بیتاب صدیقی کے علاوہ انجمن کے دیگر قائدین نے بھی شرکت کی اور وہاں دستخطی مہم کی کامیابی کے لیے ہر طرح سے اپنے تعاون کی پیش کش کی۔ ایک قلیل عرصہ میں بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی مقبولیت و افادیت پورے ہندوستان میں اس حد تک قائم ہوگئی کہ 1961ء میں مرکزی انجمن ترقی اردو ہند نے حکومت ہند کی طرف سے پورے ملک میں چلائی جانے والی مردم شماری مہم کی نگرانی کے لیے ناظم مردم شماری ہند کی حیثیت سے غلام سرور کی تقرری کی، چنانچہ آل احمد سرور کے اصرار پر غلام سرور نے چھ ماہ علی گڑھ میں رہ کر مردم شماری مہم کی خصوصی نگرانی کی، تاکہ مردم شماری فارم کے کالم میں اردو زبان کے اندراج کو یقینی بنایا جاسکے۔

اب ذرا اور تفصیل میں جائیں تو 1958ء میں مرکزی انجمن کی پہلی کل ہند کانفرنس دہلی میں ہوئی جس کا افتتاح وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا تھا۔ وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔ اس تاریخی کانفرنس میں بیتاب صدیقی کی قیادت میں بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے 75 مندوبین نے شرکت کی تھی۔ 1960ء میں کانپور میں منعقدہ مرکزی انجمن کی

دوسری کانفرنس میں بیتاب صدیقی سمیت 78 مندوبین شریک ہوئے۔ 25 اکتوبر 1966ء میں دہلی میں پنڈت سندر لال نائب صدر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند کی دعوت پر منعقدہ ملک گیر اردو مشاورتی نشست میں بہار ریاستی انجمن کی نمائندگی بیتاب صدیقی، غلام سرور اور سید غضنفر نواب دانش نے کی تھی۔ پنڈت آنند نارائن ملّا ایم پی صدر مرکزی انجمن ترقی اردو نے اپریل 1973ء میں اردو کے مسائل پر گفت وشنید کے لیے اپنی رہائش گاہ واقع دہلی پر بیتاب صدیقی کو مدعو کر کے ان سے سیر حاصل تبادلہ خیال کیا اور ہندوستان میں اردو تحریک کو فعال بنانے کے لیے کئی اہم نکات پر اتفاق ہوا۔ اس تاریخی ملاقات میں انجمن کے جنرل سکریٹری آل احمد سرور کے علاوہ چیئرمین اردو کمیٹی حکومت ہند، اندر کمار گجرال بھی شریک تھے۔

بیتاب صدیقی اردو کی مشعل لیے کبھی ریاستی انجمن کے قائدین اور رفقا کے ساتھ بہار کے ضلعوں، شہروں، دیہاتوں اور قصبوں کا دورہ کرتے رہے تو کبھی انجمن کی ضلعی شاخوں کی دعوت پر وہاں پہنچتے۔ اس کے علاوہ جب جب ضرورت ہوئی کبھی وفود کی شکل میں اربابِ اقتدار سے مل کر ان کے سامنے اردو کا مقدمہ پیش کیا تو کبھی عوام الناس کے روبرو اردو کے مسائل لیے حاضر ہوئے۔ گویا تحریک کی راہ میں انہوں نے کبھی تن آسانی کو حائل نہیں ہونے دیا۔ جس کے خاطر خواہ نتائج بھی برآمد ہوئے۔ البتہ دن رات کی مشقتوں کا منفی اثر ان کی صحت پر ضرور پڑا۔

بیتاب صدیقی کا اردو ویژن:

بیتاب صدیقی کی غیر معمولی تحریکی ویژن تک رسائی کے لیے ان کی مندرجہ ذیل تحریر کی خواندگی ناگزیر ہے، جو انہوں نے اس وقت کی تعلیم وثقافت کی مرکزی وزیر کرشنا شاہی کو مخاطب کرتے ہوئے قلم بند کی تھی۔ انہوں نے اردو کی ہمہ جہت ترقی سے متعلق تقریباً چالیس سال پہلے کانگریسی دورِ حکومت میں جو سوالات اٹھائے تھے اور جن جزئیات کی جانب حکومت کو متوجہ کیا تھا اگر وہ نیک نیتی سے ان پر عمل پیرا ہوتی تو آج اردو کی صورتحال یقیناً کچھ دیگر ہوتی۔ یہاں یہ نکتہ بھی زیرغور ہے کہ ایک عرصہ گزر جانے کے بعد اب یہ سوالات اگر ہم حکومت سے نہیں کر سکتے یا ایوانِ اقتدار میں بیٹھے نام نہاد محبانِ اردو نہیں اٹھا سکتے تو کم از کم خود سے تو یہ سوالات کر سکتے ہیں اور پھر ان کی روشنی میں اپنا احتساب بھی؟ لیکن ہم ان بنیادی سوالوں سے روز بروز دست بردار ہوتے ہوتے یہاں تک جا پہنچے کہ اردو کے بنیادی مسئلوں سے بیگانہ ہی نہیں بلکہ احساس سود و زیاں بھی جاتا رہا۔ ''اردو کے فروغ میں سرکاری دیانت داری کا دعویٰ'' کے عنوان سے بیتاب صدیقی نے جن دکھتی رگوں پر انگلیاں رکھی تھیں آج بھی وہ ہماری غیرت کو للکار رہی ہے کہ تم نے اردو کے

لیے کیا کیا؟

''تعلیم وثقافت کی مرکزی وزیر مملکت نے ترقی اردو بیورو کی پندرھویں سالانہ مجلس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ سرکار سچے دل سے یہ چاہتی ہے کہ ملک میں اردو زبان پھلے پھولے اور پروان چڑھے۔ محترمہ کرشنا شاہی نے اردو زبان کے یکساں فروغ کی خاطر مرکزی بورڈ برائے اردو ترقی اور ریاستی اردو اکادمیوں کے مابین مناسب لائحہ عمل پر زور دیا ہے نیز اس موقع پر بورڈ کے اراکین کو اردو شارٹ ہینڈ اور ٹائپنگ میں دلچسپی لینے کا پرزور مشورہ دیا ہے۔

وزیر مملکت محترمہ کرشنا شاہی لائق تحسین ہیں کہ انہوں نے تعلیم وثقافت کی وزارت کی جانب سے اردو کے معاملے میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں مرکزی بورڈ برائے ترقی اردو کے کاموں پر گہری نظر ڈالنے کی زحمت گوارا نہیں فرماتی ہیں ورنہ ترقی اردو بورڈ کے مایوس کن کارناموں کا بھی اس نشست میں اعتراف کرنا پڑتا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ترقی اردو بورڈ نے کوئی ایسا تعمیری کارنامہ انجام دینے کی کوشش نہیں کی ہے جس سے اردو کے فروغ کی راہیں کھلتیں۔ ترقی اردو بورڈ کے ذریعہ جو کتابوں کے ترجمے ہو رہے ہیں ان کی ترجمہ شدہ کتابوں کی کھپت کے لیے انہوں نے کون سا موثر طریقہ اختیار کیا ہے اور آج سائنس، معاشیات، اقتصادیات اور سماجیات کے مضامین کے باب میں کتنی تخلیقی کتابیں تیار کی ہیں اور وہ کون سے ادارے شریک نصاب ہیں؟ یہ ملک بھر میں شاید ہی کسی کو معلوم ہو۔ اس لیے کہ اردو کی تعلیم کے سلسلے میں مرکزی حکومت کے شعبہ تعلیم وثقافت نے جو مرکزی حکومت کے زیر انتظام سکنڈری اسکول کھول رکھے ہیں اس نے جو طرز عمل اختیار کیا ہے وہ حکومت کے کھوکھلے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ وزیر مملکت چراغ لے کر ملک بھر میں ڈھونڈیں تو پھر ان کو ایک بھی مرکزی حکومت کے زیر انتظام ایسا سکنڈری اسکول بمشکل ملے گا جو اردو ذریعہ تعلیم کا اسکول ہو اور حد تو یہ ہے کہ مرکزی ثانوی اسکول میں اردو مادری زبان کے معلموں کو تعلیمی نصاب میں جگہ بھی نہیں دی گئی ہے جس طرح ریاست بہار میں میتھلی کے علاوہ اردو، بنگلہ اور اڑیا کو بھی مادری زبان کے لسانی مضمون میں جگہ دی گئی ہے اور اس طرح سرکاری اور غیر سرکاری کچھ اسکولوں میں اردو مادری زبان کی حیثیت سے

پڑھانے کی سہولت حاصل ہے اور یہ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو نے اپنی تاسیس کے بعد ہی جدوجہد کر کے حاصل کی ہے۔ مرکزی حکومت سے بھی متواتر مطالبات کیے گئے ہیں لیکن آج تک اس نے اردو آبادی کے مطالبے پر توجہ نہیں دی اور تھوڑی سی توجہ دی ہے تو وہ سعی لاحاصل ہے۔ اردو طلبہ اس سے فائدہ اٹھانے سے قاصر رہتے ہیں۔ اردو کو سکنڈ لینگویج کی حیثیت سے دوسرے مضامین کے ساتھ شامل کیا گیا ہے جس کا معیار بیحد پست ہے، مرکزی حکومت سہ لسانی فارمولے کے نفاذ کے طور پر ایک بھی مرکزی اسکول نہیں قائم کر سکی ہے جس میں غیر ادبی مضامین کی حیثیت سے اس کی تعلیم دی جا رہی ہو۔ پھر جو کتابیں مرکزی اردو بورڈ شائع کراتی ہیں ان کی کھپت خود مرکزی اسکولوں میں نہیں ہوتی ہیں تو پھر کن جگہوں میں ان کی کہاں کھپت ہوگی ویسے عام مطالعہ کے لیے اردو آبادی کے لوگ اسے خرید لیتے ہیں لیکن اس سے کماحقہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔''

اس کے بعد بیتاب صدیقی نے اردو کے جس تشویشناک پہلو پر حکومت کی توجہ مبذول کرائی ہے وہ بھی قابل غور ہے:

''دنیا میں کسی زبان کے فروغ اور اسے زندہ رکھنے کے لیے اس کی تعلیم کا ہونا ضروری ہے اور اس زبان کی اشاعت رسم الخط کے ساتھ ہونا چاہیے۔ مگر مرکزی حکومت نے دستور میں دیے گئے حقوق کے تحت ملک بھر میں اردو کی ابتدائی تعلیم کا کیا حال ہے کبھی وہ خبر بھی نہیں لیتی ہے۔ اس نے بہت سے کمیشن بھی قائم کیے، ان کی سفارشات بھی بہتر سے بہتر ہیں لیکن ان سفارشوں پر عمل درآمد بھی ہوا یا نہیں ہوا، کیا حکومت نے کبھی بھی اسے جاننے کی کوشش کی؟ گجرال کمیشن، کوٹھاری کمیشن، حوالیہ کمیشن وغیرہ تعلیم سے متعلق کمیشن تھے لیکن گجرال کمیشن پر آج تک عمل درآمد نہیں ہوا اور کوٹھاری کمیشن کی سفارشات پر پورے طور پر عمل درآمد نہیں کیا جا سکا اور یہی حال حوالیہ کمیشن کا بھی ہے۔ لسانی مسئلے پر اس کی سفارشات سے اردو کو فائدہ ملک بھر میں نہیں پہنچا۔ دستور ہند نے مادری زبان کی تعلیم ہر بچے کے لیے ضروری قرار دیا ہے اور اس سلسلے میں مرکزی حکومت کافی رقم خرچ کرتی ہے۔ بہار اور یوپی نیز دوسری ریاستوں کو ہزاروں ہزار یونٹ الاٹ کرتی ہیں لیکن کبھی اس نے متعلقہ حکومتوں سے رپورٹ حاصل کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے کہ آیا اس یونٹ میں سے اردو کو کچھ

حصہ بھی ملا یا نہیں ملا۔ اگر ملا تو اردو کے لیے کتنے اساتذہ بحال ہوئے اور کہاں بحال ہوئے۔ ان کا نام ونشان بھی ہے یا نہیں ہے۔ یہ واقفیت تو مرکزی حکومت کو حاصل کرنی چاہیے تھی۔ اس سلسلے میں دس پندرہ برسوں کی یونٹ بحالی کی رپورٹ ریاستوں سے حکومت طلب کرلے تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ اردو کی ابتدائی تعلیم کو ختم کرنے کے لیے کس طرح منظم کوشش ہو رہی ہے۔ 58-1954ء میں اردو پڑھنے والے پرائمری سطح کے طلبہ کی تعداد بہار میں تقریباً چار لاکھ تھی لیکن 1980ء کی مردم شماری کے مطابق اردو مادری زبان رکھنے والوں کی آبادی تقریباً 62 لاکھ ہے۔ اگرچہ یہ تعداد کم ہے اور صحیح نہیں ہے صحیح تعداد اس سے فزوں تر ہے، لیکن بہار میں اردو پڑھنے والے اسکولی بچوں کی تعداد اب گھٹ کر دو لاکھ کے قریب رہ گئی ہے۔ اس لیے کہ ان کو ہندی یونٹ، ہندی معلم بھر دیئے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ کثیر تعداد میں واحد نفری اسکول میں بھی ہندی یونٹ دیا گیا ہے۔ اس طرح اردو کی تعلیم کو ریاست بہار کی انتظامیہ ختم کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ دیہاتوں میں پڑنے والے اردو پرائمری اسکول ہندی میں بدل دیے گئے ہیں۔ اردو گرلس پرائمری اسکول تو اب شاذ و نادر کہیں نظر آتے ہیں۔ جب یہ صورتحال ہے تو اردو پڑھنے والے ہی نہ ہوں گے تو اردو کس طرح ترقی کرے گی، پروان چڑھے گی۔''

انہوں نے بڑی جرأت مندی سے اردو اکادمی کے طرز عمل پر بھی انگشت نمائی کی ہے اور اس سلسلے میں اپنے نقطہ نظر کی دوٹوک وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اردو اکادمی تو محض ایک سراب ہے اس سے اردو کو پروان چڑھانے کا کام نہیں لیا جاسکتا ہے البتہ وہاں تفریح اور نشاط حاصل کرنے کے لیے یہ ادارے معقول ہیں۔ حکومت کو چاہیے کہ اردو اکادمیوں کے ذریعہ ابتدائی تعلیم کا سامان کرے تو شاید کچھ کام نکل سکے۔''

ایک اور اہم پہلو جو حکومت کی توجہ کے ساتھ ہمارے لیے بھی سامانِ عبرت ہے۔ مگر ہماری مجرمانہ غفلت کا انجام یہ ہے کہ فن خطاطی جو ہماری تہذیب وثقافت کا ایک جز لاینفک تھا، جس نے اسلام میں مصوری کا بہترین متبادل پیش کیا تھا، جسے دیکھ کر ذہن وقلب پر ایک خوشگوار اثر مرتب ہوتا تھا فنا کے گھاٹ اتار دی گئی۔ چنانچہ انہیں امور کی جانب ہماری توجہ مبذول کراتے ہوئے بیتاب صدیقی لکھتے ہیں:

''ترقی اردو بورڈ تمام دوسری ریاستوں کی طرح خطاطی کا مرکز قائم کرنے کے لیے اکادمی کو

امداد دیتی ہے۔ بہار میں مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے نصاب میں وسطانیہ اور فوقانیہ سطح تک خطاطی کی تعلیم کو نصاب میں لازمی قرار دیا ہے۔ صنعت وحرفت پر کروڑوں روپے خرچ ہورہے ہیں لیکن آج تک خطاطی صنعت کی تربیت اور تعلیم کے لیے حکومت نے خطاط معلم کی بحالی کی اب تک منظوری نہیں دی ہے۔ حالانکہ یہ نصاب تقریباً دس برس سے نافذ ہے۔ اس طرح ایک موقع تھا کہ خطاطوں کی معیشت کا سامان ہوتا لیکن ایسا نہ ہونے کی وجہ سے بہار میں اکادمی کے شعبے خطاطی میں بوڑھی عورتیں اور بیکار لوگ داخلہ لیتے ہیں۔ یہ مختصر روداد ہے ورنہ مضامین پیش کرنے کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ پھر کیسے یقین آئے کہ اردو کے فروغ کے لیے سرکار کی دیانت داری کا دعویٰ درست ہے اور سرکاریں سچے دل سے چاہتی ہیں کہ ملک میں اردو زبان پھلے پھولے۔''

اردو تحریک کی پچیس سالہ کہانی - بیتاب صدیقی کی زبانی:

بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام منعقدہ کانفرنس، کنونشن، جلسہ اور حکومت کو دیے گئے میمورنڈم کو وقفہ وقفہ سے منظر عام پر لانے کی روایت روزِ اوّل سے رہی ہے۔ انجمن کی پچیسویں یوم تاسیس کے موقع پر مظفر پور میں ایک سہ روزہ اردو کانفرنس 1975ء میں ہوئی تھی، جس میں بیتاب صدیقی نے بحیثیت جنرل سکریٹری انجمن کی پچیس سالہ کارگزاریوں کا لیکھا جوکھا سکریٹری رپورٹ کی شکل میں پیش کیا تھا۔ 64 صفحات پر مشتمل اس کتابچے کے ابتدائیہ کے مطالعے سے انجمن کی کارگزاریوں کے ساتھ بیتاب صدیقی کے عزائم کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اگر چہ کسی بھی سکریٹری رپورٹ کی زبان عموماً دفتری اور سرکاری ہوتی ہے، لیکن اس رپورٹ کے مطالعے سے بیتاب صدیقی کی انشاپردازی اور اسلوب بیان کی شگفتگی کا اندازہ بھی بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

''میں جس مردم خیز سرزمین میں آپ کو دوسری بار پندرہ برسوں کے بعد خوش آمدید کہنے پر فخر وطمانیت محسوس کررہا ہوں وہ ہمیشہ زبان وادب کی سرگرمیوں کا گہوارہ رہی ہے۔ اردو زبان وادب کو پروان چڑھانے اور لسانی بیداری پیدا کرنے میں اس نے جو حصہ لیا ہے اس کا مجھے پوری طرح احساس ہے۔ یہ فخر اسی سرزمین مظفر پور کو حاصل ہے کہ اردو کی سب سے پہلے ''سائنٹفک سوسائٹی'' اسی شہر میں قائم ہوئی جس کا مقصد سائنس اور دوسرے علوم کی کتابوں کو اردو زبان میں منتقل کرنا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے آج بھی اہل انجمن کوشاں ہیں۔

سوسائٹی نے تعلیمی میدان میں سیکولر طریقہ تعلیم کی بھی یہاں بنیاد ڈالی جو پورے بہار میں پھیل گئی۔ دوسری طرف نہ صرف بہار بلکہ ملک بھر میں صوفیائے کرام اور درویشان عظام اور انہیں کی طرح سنتوں اور مہاتماؤں نے اپنی انسان دوستی پر مبنی روحانی تجلیات اور اپنے مذہب عشق کی تبلیغ کے لیے اسی زبان کو اپنایا اور اسی زبان اردو کے ذریعہ پیغام محبت پھیلایا جن کی بدولت اس گئے گزرے دور میں باہمی میل جول اور خوشگوار تعلقات ہی نہیں بلکہ ایک مشترکہ تہذیب وتمدن کے بے شمار جلوے یہاں نظر آتے ہیں اور آج بھی اردو ہندوستان کے مشترکہ تمدن کی پیداوار اور ہندو مسلمان کی ناقابل تقسیم میراث کہلاتی ہے جب تک ہندوستان کی سیکولر حکومت اس مشترکہ تہذیب کے تصورات کو اپنا رہنما بنائے رہے گی اردو کو اس کے مقام سے ہٹایا نہیں جاسکتا، اردو سے قطع تعلق کرکے یہاں کے جدید ادب کی تعمیر ناممکن ہے۔

بہار میں اردو کا تعلق انہیں انسانیت نواز روایات سے ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اردو شمالی بہار کے سرسبز خطہ مظفر پور کے ماحول میں نہ صرف جمہوری سانچے میں ڈھلتی جائے گی بلکہ اس کے رگ وپے میں کسانوں اور محنت کش اردو دوست عوام کے مبارک پسینے اور خون کی آمیزش سے ایک نئی شادابی اور تازگی آتی رہے گی۔

آج آپ کو یہاں جوق در جوق بلا تفریق مذہب وملت اتنی بڑی تعداد میں دیکھ کر مسرت کا بے پایاں سمندر دل میں موجزن پاتا ہوں۔ آپ یہاں جو نہ صرف ضلع مظفر پور نہ صرف شمالی بہار بلکہ ریاست بہار کے دور دراز مقامات سے اس معاشی تنگ حالی اور ہوش رُبا گرانی کے دور میں بھی سفر کی تکلیفیں گوارا کرتے ہوئے صرف اس تاریخی اردو کانفرنس کے مقاصد کو کامیاب بنانے کے لیے تشریف لائے ہیں اور ہر طبقے اور فکر وخیال سے تعلق رکھنے والے حامیان اردو اور زبان وادب کی خدمت میں پیش پیش رہنے والے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ بلکہ آپ کے اس عزم سفر سے آپ کے آئندہ عزم وحوصلے کا پتہ چلتا ہے۔ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ تہہ دل سے آپ کا خیر مقدم کروں۔

میں جانتا ہوں کہ اردو کے ساتھ آپ کو دلی لگاؤ اور بے پایاں خلوص ومحبت ہے اسی کا یہ ادنیٰ کرشمہ ہے کہ کشاں کشاں آپ یہاں چلے آئے ہیں۔ آپ کی اتنی گہری دلچسپی کو دیکھ کر میں

بے حد مسرور ہوں کہ آسمان اردو پر جو تھوڑی بہت مایوسی، بددلی اور جمود و تعطل کی گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں جلد ہی چھٹتی نظر آئیں گی۔

اردو صدیوں سے غیر مذہبی اور غیر طبقاتی بنیادوں پر ارتقائی منازل طے کر رہی ہے۔ آج بھی اردو نامساعد اور معاندانہ حالات کے باوجود آزاد و سیکولر جمہوریہ ہند اور ریاست بہار کے اندر بسنے والے ہر عقیدہ اور فرقے کے لوگوں کی مشترکہ زبان ہے۔ بلاشبہ ایسے ہندو مسلم اور سکھ ایک بھاری تعداد میں ریاست کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں جو اردو کو اپنی مادری زبان مانتے ہیں۔ ان کی تعداد سرکاری اعداد و شمار 71ء کے مطابق پچاس لاکھ ہے۔ بہار میں اردو کی ابتدا ہندوستان میں اردو کی پیدائش کے ساتھ ہی ساتھ ہوئی اور یہ حقیقت ہے کہ دلی اور یوپی کے ہمراہ بہار بھی اردو کا گہوارہ رہا ہے اور مغلیہ دور سے دورِ افرنگ اور فرنگی دور غلامی سے تادم تحریر اردو نے ایک رابطے کی زبان کا نہایت اہم رول اس ملک میں ادا کیا ہے۔ نہ صرف یہ کہ اردو ملک کے اندر قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کی فضا ہر دور میں بنائے رہی بلکہ پوری جنگ آزادی دراصل اردو کی رہین منت ہے۔ جنگ آزادی کے ہر مرحلے پر اردو پیش پیش رہی اور قربانیاں بھی دینے میں ہمیشہ صف اوّل میں نظر آئی۔ آخری مغلیہ فرماں رواں شہنشاہ ظفر کے تمام تر شاعرانہ جذبات حب الوطنی میں ڈوبے ہوئے ہیں جنہیں یہ حسرت رہ گئی کہ:

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں

غرض کہ شاہ ظفر سے لے کر شہید بھگت سنگھ اور شہید اشفاق اللہ خاں مرحوم تک قربانیوں کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے جنہوں نے آزادی وطن کے متوالوں کو حوصلہ بخشا ہے، لیکن آزادی کے بعد اس ملک کی لسانی دنیا میں بڑی بڑی تبدیلیاں آئیں اور:

یاران تیز گام نے منزل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

آزاد ہندستان کی تاریخ کا ایک نہایت اندوہناک حادثہ اور سانحہ عظیم ہے کہ اردو کی تمام قربانیوں، اس کی طویل خدمات اور اس کی رعنائیوں کو پس پشت ڈال دیا گیا اور یکسر نظر انداز

کر دیا گیا۔

زبان کا مسئلہ اس ملک میں انگریزی سامراج کی منظم سازش کے تحت آزادی سے بہت پہلے ہی پیدا ہو چکا تھا اور جب انگریزی سامراج کے اس ملک سے پیر اکھڑنے لگے تو پھر اس نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ متعصّبانہ لسانی سامراج پروان چڑھانے کی داغ بیل ڈالنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ آزادی کے چند برسوں پہلے اس مسئلے کا ایک حل عبدالحق راجندر پیکٹ کی شکل میں تجویز کیا گیا جسے ابھرتی ہوئی لسانی سامراجیت نے ناکام بنا دیا، یہ حل اردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں ہندوستانی کو ملک کی سرکاری زبان بنانے کا منصوبہ تھا مگر 26 جنوری 1950ء سے ہندی دیوناگری رسم الخط میں ہمارے ملک کی زبان قرار پائی، انہیں لمحات میں ہمارا عظیم ملک آزاد جمہوریہ بنا جس کے دستور کی شیڈول 8 میں ملک کی چودہ قومی زبان کی فہرست میں اردو کو بھی جگہ ملی جس نے اردو دوستوں کو سہارا دیا اور انہیں ملک کی نئی فضا میں آگے بڑھنے کا موقع ملا۔ اگرچہ عام طور پر ملک میں بڑی مایوسی اور بددلی پھیلی ہوئی تھی۔ اسی فضا میں اردو دوستوں نے مئی 1951ء میں بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی داغ بیل ڈالی۔ یہ وہ حوصلہ شکن دور تھا کہ اردو سے اپنے مایوس بیگانے ناخوش اور بیزار تھے۔

اس موقع پر میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اجمالی طور پر ان کی کوششوں کا مختصر ذکر کروں جو اردو کی بقا و تحفظ کے لیے بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی سالانہ کانفرنسوں کے فیصلوں کے بعد عملی اقدامات میں آئے تاکہ آپ ان کارگزاریوں کی روشنی میں میری اور اپنی ذمہ داریوں کو سمجھ سکیں۔ میرا مقصد کسی کارنامے کا شمار نہیں بلکہ صرف یہ کہ اس کی روشنی میں آئندہ کے لیے کوئی ٹھوس پروگرام اردو دوست مرتب کر سکیں اور آپ کو ہماری جدوجہد کا سرسری اندازہ بھی ہو سکے۔ آپ یہ سمجھ سکیں کہ نامساعد حالات اور وسائل کی عدم موجودگی کے باوجود انجمن نے اردو کے مسئلے پر اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی اور غفلت سے کام نہیں لیا۔ وقت کی تنگی مانع ہے ورنہ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی ان خدمات سے بھی قدرے آپ کو روشناس کرنا ضروری تھا جو 1951ء سے اب تک تقریباً پچیس برسوں میں انجام دی گئیں“۔

(تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو سکریٹری رپورٹ از بیتاب صدیقی جنرل سکریٹری بہار ریاستی انجمن ترقی اردو، برائے بہار ریاستی اردو کانفرنس منعقدہ بمقام ٹاؤن ہال مظفر پور، 25,26,27

اپریل1975ء)

اس مختصر باب میں بیتاب صدیقی یا انجمن کے کارناموں کا مفصل ذکر ممکن نہیں۔ انجمن اپنی بنیاد سے 1980ء تک، جو اس کا عہد زرّیں بھی تھا، انتہائی سرگرم اور فعال رہی جس کے نتیجے میں اس نے اردو اور اقلیتوں کے تعلق سے متعدد محاذ پر اپنے فتوحات کا پرچم لہرایا، لیکن بدقسمتی سے انجمن رفتہ رفتہ ''جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں'' کی مصداق بن گئی۔ جو ہیں وہ اپنی عمر طبعی کو پہنچ کر معذور ہیں اور جو خونِ تازہ رکھنے والے ہیں وہ مایوسی، بددلی اور تن آسانی کے شکار ہیں۔ مادری زبان اردو کا تحفظ ان کی ترجیحات سے دبے پاؤں باہر نکل گیا، البتہ دل کو بہلانے کے لیے مشاعرے آج بھی مقبول ہیں۔ جلسے، سمینار اور سمپوزیم کچھ تو ضروریات ہیں ورنہ ان کی حیثیت اردو تحریک کے حوالوں سے سالانہ 'عرس' جیسی ہوگئی ہے۔

بہار ریاستی انجمن ترقی اردو، اس کے بانیان اور بعد میں اس تحریک سے وابستہ ہونے والوں کے کارناموں پر وقت کی موٹی گردیں پڑتی جا رہی ہیں۔ البتہ قصہ پارینہ کی شکل میں ہفتہ وار اور روزنامہ 'سنگم' پٹنہ کی فائلیں انجمن کا نایاب اور کمیاب لٹریچر اور پھر نئے پرانے ملا کر جو کُل متاع گراں ہیں ان میں شائل نبی، سید شہباز حسین، سید غیاث الرحمٰن غوثی، پروفیسر احسان اشرف، سید وجیہ الدین احمد ایڈووکیٹ، سید خورشید پرویز، ریاض عظیم آبادی، فخر الدین عارفی، مظاہر الدین احمد ایڈووکیٹ، انوار الحسن وسطوی، ریحان غنی، اسلم جاوداں وغیرہ وغیرہ ابھی بھی ذہنی، فکری و عملی طور پر بہار میں اردو تحریک کی آبرو کے طور پر باقی ہیں۔

بیتاب صدیقی اور غلام سرور

(اردو تحریک بہار کی لازم وملزوم شخصیتیں)

بیتاب صدیقی اور غلام سرور کی ساٹھ سال سے زائد کی پبلک لائف میں دوستوں، جانثاروں، ہمدردوں، مخلصوں، ملاقاتیوں اور قدرشناسوں کے ساتھ ناقدوں، نکتہ چینوں، شکوہ سنجوں اور معترضین کا وسیع ترین حلقہ بہار میں ہی نہیں دیس بدیس تک پھیلا ہوا تھا۔ ان دونوں شخصیتوں کی معروف ترین جوڑی کے ساتھ 1951ء سے پہلے اور اس کے بعد لوگ آتے اور جاتے رہے۔ مگر غلام سرور کے ہائی اسکول کی طالب علمی کے زمانے سے بیتاب صدیقی کو ان سے جو قربت اور ذہنی ہم آہنگی رہی وہ مرتے دم تک قائم رہی۔ دونوں دو جان ایک قالب تھے۔ دونوں کے عزائم ایک، ہدف ایک اور نصب العین ایک، دونوں اردو تحریک کے شیدائی اور دیوانے، قوم وملت کے دکھ درد کے اسیر۔ ان کی مشترکہ خوبی یہ بھی تھی کہ دونوں اپنے طالب علمی کے دور میں اردو کے حوالوں سے عوامی زندگی میں داخل ہوئے۔ ایک کا میدانِ عمل پٹنہ یونیورسٹی کے راستہ سے گزرتا تھا تو دوسرے کی راہ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ سے نکلی۔ ایک کا نقیب 'ساتھی' اور 'سنگم' تو دوسرے کی آواز 'طوفان' اور 'مومن دنیا'۔ بہار میں اردو تحریک ہو، مسجد اقصیٰ کی بازیابی کی مہم ہو، بہاری بچاؤ اندولن ہو یا بہار مدرسہ بورڈ کی بہتری کے لیے جدوجہد دونوں کا مطمحِ نظر ایک تھا، پھر ملک میں آئے دن رونما ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کے سد باب کا معاملہ ہو کہ اقلیتوں، پسماندوں و کمزوروں پر ڈھائے جانے والے مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی بات... غلام سرور اور بیتاب صدیقی ہمیشہ سینہ سپر رہے اور ایک ساتھ مل کر نظریاتی و عملی جنگیں لڑیں۔ حکومت وقت کو جھنجھوڑا، للکارا، اسے خبردار کیا نتیجے کے طور پر سرکاری عتاب کے شکار ہوئے اور قید وبند کی صعوبتیں بھی اٹھائیں۔ انہوں نے جو قربانیاں دیں وہ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ ان کی انہی خوبیوں کی وجہ سے ملت کے درمیان

ان کی منفرد شناخت قائم ہوئی اور ابدی شہرت حاصل ہوئی، جس کی نظیریں کم ہی ملتی ہیں۔ آج بھی متعدد عینی شاہدین موجود ہیں جنہوں نے اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ملت نے انہیں گالیاں بھی دیں اور سر پر بھی بیٹھایا۔ اب ایسی شخصیتیں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتیں۔ بقول شاعر

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

بیتاب صدیقی اور غلام سرور بہار میں اردو تحریک کے دو ایسے فعال اور متحرک کردار تھے جن کا نام آتے ہی پوری اردو تحریک کا خدوخال، اس کے نشیب وفراز کی داستان اور اس کی کامیابی وناکامی کے منظرنامے سامنے آجاتے ہیں۔ بیتاب صدیقی کا 'بزم اردو'، 'اردو سکھاؤ' مہم ہو یا غلام سرور کا 'حلقہ ادب بہار' اور 'مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن' سے لے کر بہار ریاستی انجمن ترقی اردو تک کا سفر------ کہنے کو تو یہ انجمنیں، ادارے، تنظیمیں اور تحریکیں بہار میں اردو کو اس کے آئینی ودستوری حقوق کی بازیابی کے لیے اٹھی تھیں لیکن اسی کے ساتھ آزادی کے بعد ملک میں مسلمانوں کے جملہ جمہوری وآئینی حقوق کے تحفظ اور ان کی حصولیابی کے لیے سرگرم عمل تھیں۔ چنانچہ مختلف ملی، سیاسی ومذہبی مکتبہ فکر کے حامل شخصیتوں نیز سیکولر طاقتوں کے تعاون سے انہوں نے ایک طرف اردو دوستوں کو بیدار، ہوشیار، فعال اور متحرک کیا تو دوسری جانب حکومت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کیں اور جب بات سے بات نہ بنی تو اس کی چولیں بھی ہلا دیں یہاں تک کہ ایوان اقتدار میں زلزلہ آ گیا۔ کیوں کہ انجمن کی قیادت میں اردو کی یہ تحریک محض ایک لسانی، ادبی وثقافتی نہیں بلکہ یہ اپنے قیام کے اوّلین دن سے اقلیتوں کے تقریباً جملہ مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے ایک منظّم اور مسلسل جدوجہد تھی۔ البتہ اردو زبان کو اس کے رسم الخط کے تحفظ کی گارنٹی کے ساتھ اس کا فروغ وبقا انجمن کے ہدف کے بنیادی مقاصد میں شامل تھے۔ اس کے علاوہ تعلیم، ملازمت، اقلیتی اسکولوں میں اقلیتی کردار کی بحالی، مکتب سے لے کر اردو ہائی اسکولوں میں اردو درس وتدریس کا نظم، گرلس اسکولوں کی بنیاد، بہار کی یونیورسٹیوں میں علاحدہ شعبہ اردو اور اردو پڑھنے والے طلبہ کی تعداد کی نشستوں میں اضافہ، بہار میں ایک اردو یونیورسٹی کا قیام، محکمہ تعلقات عامہ بہار سے ایک اردو رسالے کا اجرا، آل انڈیا ریڈیو کے چوپال پروگرام میں اردو زبان میں ایک اردو داں کیریکٹر کی شمولیت جیسے مطالبات تھے۔ جن میں بعض پر حکومتوں نے عمل درآمد کیے، بعض افسرشاہی کی نذر ہو گئے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کے تحفظ، فرقہ وارانہ فسادات کے تدارک، مسلمانوں کی معاشی واقتصادی فلاح وبہبود کے مواقع، مذہبی ولسانی اقلیتی کمیشن کا قیام، سروس کمیشن کے امتحان میں اردو ایک مضمون

رکھنے، بہار ٹکسٹ بک کارپوریشن سے اردو سمیت دیگر علاقائی زبانوں میں نصابی کتابوں کی بروقت اشاعت وتوسیع، سہ لسانی فارمولہ کا نفاذ جیسے کثیر الجہات اور دوراندیشانہ مطالبات بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے لائحہ عمل کا ایک حصہ تھا۔ اسی کے ساتھ جمہوریت کے فروغ اور ملک وملت کی صحت مند خطوط پر رہنمائی کے لیے انجمن نے اپنے پلیٹ فارم سے مؤثر اقدامات کیے اور اس کے لیے روزانہ 'سنگم' پٹنہ میں اداریوں اور خبروں کی تواتر سے اشاعت کے ذریعہ حکومت کو متوجہ رکھا۔ انجمن وقفہ وقفہ سے کانفرنس، کنونشن، میٹنگ، جلسہ جلوس اور مظاہرے کا انعقاد کرتی رہی، نیز حکومت کو میمورنڈم اور عرضداشت کے ذریعہ پیہم یاددہانی اور ملاقاتوں کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ انجمن نے ان کی رودادیں شائع کیں تاکہ عوام الناس کو ان اقدام سے آگاہ کیا جا سکے۔ غرض کہ آئینی وجمہوری حدود میں رہ کر اس نے اپنی بساط بھر ہر وہ اقدام کیے جن کی نظیریں پچاس سالہ اردو کی تاریخ میں نہیں ملتیں۔ ان تمام سرگرمیوں اور جدوجہد میں اردو کے جو دو جانباز سپہ سالار ہمہ وقت، ہمہ تن اور ہمہ دم آگے آگے تھے ان میں ایک بیتاب صدیقی اور دوسرے غلام سرور تھے۔

1968ء میں انجمن کی سالانہ کانفرنس میں ایک اردو یونیورسٹی کے قیام کے مطالبہ کی تجویز منظور کی گئی تھی، 1995ء میں جب مولانا ابوالکلام نیشنل اردو یونیورسٹی (MANUU) کی تاسیس کی تجویز مرکزی حکومت کے زیر غور آئی تو بہار میں اس کے قیام کے اپنے دیرینہ مطالبے کو لے کر انجمن ایک بار پھر مستعد اور سرگرم ہو گئی۔ چنانچہ اردو یونیورسٹی کی حمایت میں بوٹ کلب، دلی، پر دھرنے کے لیے بہار سے بڑی تعداد میں ایک اعلیٰ سطحی وفد تو روانہ ہوا ہی دہلی اور آس پاس کی ریاست سے بھی لوگ وفد کی حمایت میں شامل ہو گئے۔ اس وقت غلام سرور کے ایک پاؤں میں ہیئر فریکچر کی وجہ سے بینڈیج لگا تھا لہٰذا وہ چلنے پھرنے سے معذور تھے۔ ادھر بیتاب صدیقی دسمبر کی شدید سردی کی وجہ سے جاڑا بخار اور تنفس کے عارضہ میں مبتلا تھے۔ کاروانِ اردو نے ایک بار پھر اپنے ان دونوں قائدین کی جانب امید بھری نگاہوں سے دیکھا۔ غلام سرور وہیل چیئر کی مدد سے پٹنہ جنکشن اور پھر وہاں سے بوٹ کلب، دلّی پہنچے جب کہ بیتاب صدیقی کو کمبل میں لپیٹ کر سید مظفر امام وہاں لے گئے۔

مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی تحریک میں غلام سرور قائد اور لیڈر کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی قائدانہ صلاحیتوں سے ان سے بڑی عمر کے لوگ بھی متاثر تھے۔ حافظ شمس الدین شمس منیری، محمد ایوب ایڈووکیٹ، سید جعفر امام، شاہ مشتاق احمد وغیرہ کا اپنا ایک حلقہ تھا۔ ایک دن ان لوگوں نے بیتاب صدیقی کو

تیار کیا کہ اگر سرور صاحب ان کے حلقے میں شامل ہو جائیں تو یہ بہت بڑی بات ہوگی۔ اگرچہ اس زمانے میں بیتاب صدیقی مذکورہ شخصیتوں کے علاوہ دیگر سرکردہ لوگوں کی حمایت سے اپنی اردو تحریک چلا رہے تھے۔ لیکن جیسے ہی یہ تجویز سامنے آئی انہوں نے غلام سرور کو ہموار کرنے میں کوئی تاخیر نہیں کی، کیوں کہ غلام سرور بھی ان لوگوں کے ساتھ مختلف پلیٹ فارم سے کام کر چکے تھے۔ چنانچہ وہ غلام سرور کو اپنے حلقے میں لانے میں کامیاب ہوگئے۔ لطف یہ کہ اس میں مذہبی ہستیاں بھی تھیں، کانگریسی بھی، کمیونسٹ اور سوشلسٹ بھی۔ یہ مشترکہ محاذ اردو کے نام پر وجود میں آیا تھا، جو خود میں ایک نظیر تھی۔ چونکہ وہ غلام سرور سے پہلے سے شناسا اور مانوس تھے اور سرور صاحب میں بھی کچھ کر گزرنے کا حوصلہ اور جذبہ تھا۔ اس لیے انہیں فکری و عملی اشتراک حاصل کرنے میں کوئی مشکل درپیش نہیں آئی۔ آگے چل کر وہ قائد اردو ہو گئے۔

سرور صاحب کی ابتدائی دنوں کی جفاکشی کے بارے میں بیتاب صدیقی نے انکشاف کیا کہ اس زمانے میں وہ روزانہ داناپور سے پٹنہ آتے تھے۔ اس درمیان ایسا بھی ہوا کہ انہوں نے، ایوب صاحب نے اور مشتاق صاحب نے انہیں زادِ راہ بھی دیا۔ سرور صاحب کی مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے علاحدگی کے ساتھ فیڈریشن مردہ ہوگئی۔ جب تک وہ اس میں رہے فیڈریشن بھی سرگرم رہی، اسی کے ساتھ پورے بہار اور اس سے باہر بھی غلام سرور اچھی طرح متعارف ہو چکے تھے۔ غلام سرور کے 'ہفتہ وار نوجوان' کا 'ہم کیا کریں؟' سے ان کی مقبولیت اور بڑھی۔ اس میں بڑے اچھے اچھے اور کام کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ اسی کے کسی شمارے میں بیتاب صدیقی کا ایک مضمون ''مسلم لیگ تحریک کی ضرورت کیوں'' شائع ہوا تھا۔ جس کی نوعیت سیاسی اور کانگریسی تھی۔ آزادی کے بعد بیتاب صدیقی چاہتے تھے کہ مسلمان کانگریس سے رشتہ جوڑ لیں اور سیاسی مفاد حاصل کرنے کے لیے کانگریس میں آجائیں۔ اس سلسلے کے ایک دلچسپ واقعہ کا انکشاف کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

''میں خود کچھ ماہ تک مسلم لیگ میں رہا۔ ان کی شمولیت مصلحت کی بنیاد پر ایک خفیہ حکمت عملی کے تحت ہوئی تھی۔ تاکہ ان کی نقل و حرکت کو دیکھا جائے اور ان میں سے افراد کو توڑ کر اپنے حلقہ میں لایا جائے۔ جب تک وہ رہے انہوں نے نہ کوئی عہدہ قبول کیا اور نہ کوئی رقم لی۔ مسلمانوں کو کانگریس میں لانے کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں نے جنگ آزادی میں جو قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے اس سے سرکار اور عوام الناس کو روشناس کرایا جائے۔ مسلمانوں پر یہ عمومی الزام تھا کہ انہوں نے پاکستان بنوایا اور ملک کی تقسیم کرادی...... تقسیم ہند کی ذمہ داری

ان پر ڈالنا سراسر بے انصافی ہوگی۔ عدم واقفیت کی بنیاد پر ایک بڑا طبقہ اس سے غافل ہے اور کچھ لوگ مصلحت سے کام لے کر اس نازک مسئلے پر خاموش ہیں۔''

آزادی کے فوراً بعد اقلیتوں کا ایک بڑا طبقہ مایوسی اور پژمردگی کا شکار تھا اور بعض 15 راگست 1947ء کے بعد اردو کے تمام مطالبات سے اخلاقی طور پر برأت کا اعلان کر چکے تھے، چنانچہ ان متضاد صورتحال سے نبرد آزما ہونے کے لیے بہار ریاستی انجمن ترقی اردو نے اردو تحریک چھیڑ دی تھی، تاکہ لوگوں میں نیا جوش و خروش پیدا ہو۔ انجمن اپنے قیام سے لے کر جب تک غلام سرور اور بیتاب صدیقی کی جان میں جان رہی اردو کے مطالبات تسلیم کرانے کے لیے برسر اقتدار طبقہ سے برسرپیکار ہوتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ انجمن نے کبھی حکومت سے کوئی مراعات یا گرانٹ قبول نہیں کی۔ بقول بیتاب صدیقی اگر چاہتے تو سرکاری گرانٹ حاصل کر سکتے تھے۔ موٹی سی موٹی رقم حاصل کر سکتے تھے، لیکن وظیفہ خوار اور مال زادی انجمن کس منہ سے حکومت کی آنکھ میں آنکھ میں ڈال کر باتیں کرتی اور پھر کس اخلاقی جرأت سے کیدار پانڈے کو انتخابی شکست دیتی اور پھر کیوں کر کے. بی. سہائے انجمن کے ایک دیرینہ اور مخلص کارکن رامائن سنگھ کی موجودگی میں غلام سرور کے سامنے یہ اعتراف کرجاتے کہ مکھیہ منتری پنڈت بینودانند جھا نے بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے ساتھ کیے گئے وعدوں سے مکر کے ایک بڑی غلطی کی ہے۔

ایمرجنسی کے دور میں انجمن دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ نئی انجمن کی قیادت پروفیسر عبدالمغنی نے سنبھالی۔ 1981ء میں حکومت بہار نے اردو کو چند مخصوص مقاصد کے استعمال کے لیے دوسری سرکاری زبان بنانے کا اعلامیہ جاری کیا۔ جسے بہار ریاستی انجمن ترقی اردو نے اس کی کئی خامیوں کی وجہ سے مسترد کردیا، اس لیے بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیئے جانے کے بعد بھی انجمن لگاتار تحریک چلاتی رہی اور بعض دستوری ضمانتوں کی جانب حکومت کو متوجہ کرتی رہی۔

اردو کے تحریکی حلقوں اور غلام سرور اور بیتاب صدیقی کے معاصرین میں یہ بات عام ہے کہ بیتاب صدیقی غلام سرور کو 'عزیزم' کہہ کر مخاطب کرتے تھے جب کہ غلام سرور تمام تر بے تکلفی کے باوجود ہمیشہ انہیں حضرت مولانا بیتاب صدیقی سے موسوم کرتے رہے۔ اس کی معنویت قارئین کے لیے یقیناً دلچسپی کا باعث ہوگی۔ غلام سرور اپنے والد عبدالحمید کے اکلوتے فرزند تھے۔ وہ سرور صاحب کے متعلق فکرمند رہا کرتے تھے کیوں کہ وہ دور طالب علمی سے ہی پبلک لائف میں آگئے تھے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ وہ سول سروسیز میں آئیں یا وکالت کریں۔ (غلام سرور کے خاندان میں درجنوں نامی گرامی وکلاء

گزرے ہیں) مگر انہوں نے ان کے دونوں ارمانوں پر پانی پھیر دیا۔ جب بیتاب صدیقی کی عبدالحمید صاحب سے ملاقات ہوتی تھی تو وہ کہتے تھے ''اسے (سرور صاحب کو) اپنا بیٹا سمجھ کر سکھایئے، سمجھایئے، کچھ پڑھایئے۔'' جس پر ان کے چچا عبدالمالک جو ایک نامور وکیل تھے ردّعمل کے طور پر کہتے کہ ''جب یہ بزعم سیاست باپ کی نہیں سنتے ہیں تو آپ کی کیا سنیں گے۔'' بیتاب صاحب کا قول ہے کہ ہم کہتے تھے کہ یہ 'عزیزم' ضرور مانیں گے۔ بس اسی زمانے سے آج تک (1998ء) وہ انہیں عزیزم ہی کہتے رہے۔ بیتاب صدیقی کے مطابق: ''بچپن سے ہی 'عزیزم' شریر لڑکا تھا، ہم ان سے بے تکلف بھی تھے اور میں نے انہیں شوخ بھی کر رکھا تھا۔ لیکن مہذب اور قدردان تھے۔ جو خاندان اور گھر سے انہیں توارث میں میسر ہوا تھا۔ اعلیٰ قدروں سے واقفیت، مناسبت اور موافقت سے یہ خوبیاں پیدا ہوئی تھیں۔'' انہیں اوصاف نے بیتاب صدیقی کو غلام سرور کا گرویدہ بنا دیا۔ اختلاف لیگ کے زمانے میں ہوا۔ سیاسی سطح پر جھگڑا اور بحث و مباحثہ بھی ہوتا، لیکن بول چال بند ہونے کا آج تک سوال ہی نہیں۔ جب تک صحت رہی ان کے ساتھ ساتھ رہے۔ انہیں قائد ماننے، ان کی قیادت کو تسلیم کرنے، ان کو آگے بڑھانے میں کبھی کجروی سے کام نہیں لیا اور نہ پس و پیش کیا۔ اس لیے کہ وہ تقریر کا ہنر اور لکھنے کا فن جانتے تھے۔ اُن کی صلاحیتوں کا لوگ لوہا مانتے تھے، ہم لوگوں نے ان کی ہمت افزائی کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ اصولی اختلاف ہوا ختم ہو گیا۔ لیکن ہاں وہ ضدی تھے، جب باپ سے اختلاف رہتا تھا تو دوسرے سے لڑنے اور ضد میں کچھ کر جانے میں تکلف کیسے ممکن تھا۔ اسی ضد میں وہ اپنی دولت کو پانی کی طرح روزنامہ 'ساتھی' اور 'سنگم' میں بہاتے گئے۔ نفع و نقصان سے بے خبر گھر بار 'سنگم' کی نذر ہوتا گیا۔ جب 'سنگم' کو پیسوں کی ضرورت پڑی تو بیتاب صدیقی نے آج سے کوئی پچاس سال پہلے تیس ہزار روپے چندہ کر کے دیا کیوں کہ 'سنگم' کا جاری رہنا بہت ضروری تھا۔ اسے اکثر مالی دشواریوں کا سامنا رہا ہے۔ چونکہ یہ اخبار کانگریس مخالف اور مسلمانوں، اقلیتوں، پسماندوں اور مظلوموں کا شروع سے ترجمان رہا اس لیے اکثر و بیشتر اس پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے۔ سرکاری اشتہارات دینے میں بھی غیر منصفانہ رویہ حکومت اور اس کے حکام نے اپنایا۔ حد تو یہ ہے کہ یہ اخبار بلیک لِسٹڈ بھی رہا۔ ایمرجنسی کے خاتمہ کے بعد جب ملک کے وزیر اعظم آنجہانی مرار جی ڈیسائی اور وزیر داخلہ آنجہانی چودھری چرن سنگھ ہوئے تو روزنامہ 'سنگم' کو بلیک لسٹ کی فہرست سے نکالا گیا۔ مگر اس کے بعد غیر کانگریسی سرکار مرکز اور ریاست میں بہت کم رہی۔ اس لیے سرکاری اشتہارات کے معاملے میں اسے ہر زمانے میں حکومت کی پالیسیوں کا شکار ہونا پڑا۔ پھر اردو اخبار کے قارئین کا معاملہ بھی کسی سے

پوشیدہ نہیں۔ کچھ خود اخبار کی انتظامیہ بھی ڈھیلی ڈھالی رہی اور غلام سرور پر ہمیشہ تکیہ کرتے رہنے کی وجہ سے اس کے عملوں نے اس کے سرکولیشن اور فروختگی پر مستعدی سے دھیان نہیں دیا جو ایک بدقسمتی کی بات ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ''سنگم'' اور ''خسارہ'' دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت ہو کر رہ گئے اور اپنے آغاز سے لے کر اب تک کئی بار عارضی طور پر بند ہوا۔ ویسے جہاں تک اس کے عارضی بند ہونے کا سوال ہے دوسری زبان کے بڑے بڑے اخبار، بڑے بڑے سرمایہ کاروں اور پونجی پتیوں کے اخبار بھی بند ہوئے۔ بعض ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے۔ خود پٹنہ سے 'آریہ ورت'، 'انڈین نیشن'، 'پردیپ' بند ہوئے اور پھر نکلے، 'نو بھارت ٹائمز' تو ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ 'پاٹلی پترا ٹائمز' کی بھی اشاعت مدت سے بند ہے۔ روزنامہ 'قومی آواز' اور 'ایثار'، پٹنہ مرحوم و مغفور ہو گئے۔ خاکم بدہن وہ وقت آئے کہ 'سنگم' بند ہو، اسے کسی قیمت پر بند نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ 'سنگم' محض اردو کا ایک اخبار ہی نہیں، اردو کے اخبار تو بیشمار ہیں، پٹنہ سے بھی اس سے باہر بھی۔ مگر ''سنگم'' کا اپنا ایک نصب العین ہے ایک مطمح نظر ہے، ایک تحریک ہے، ایک صدائے احتجاج ہے۔ جس کا ہمارے ساتھ ساتھ جاری رہنا اشد ضروری ہے۔

مختصر یہ کہ غلام سرور نے 'سنگم' پٹنہ اور کلکتہ کے لیے اپنی ساری کمائی، تمام پونجی، باپ دادا کی چھوڑی ہوئی دولت اس کی نذر کر دی۔ جہاں سے جو ملا اس میں لگتا گیا۔ وہ تو کیسے کیسے کر کے ان کی بیگم صاحبہ کی وجہ کر ایک مکان دانا پور کا بچ گیا۔ اگر سرور صاحب کا زور چلتا تو وہ اسے بھی صاف کر دیتے۔ غلام سرور نے 'سنگم' کے ذریعہ جو قربانیاں دیں، جتنی مرتبہ جیل گئے، جس حال و احوال میں ان کے بال بچے رہے، اس درمیان ان پر کیسی گزری، وہ تاریخ کا ایک ایسا سیاہ باب ہے جس نے اردو اور اردو آبادی کو روشن کر دیا۔ یہ اسی اخبار کا کارنامہ ہے کہ اس میں بہاری مسلمانوں کو پژمردگی، خود فراموشی، بے دلی و مایوسی کی نحوست سے آزاد کرایا۔ ہر آڑے وقت میں سینہ سپر ہو کر سامنے آتا رہا۔ خواہ وہ مسلمانوں کی پسماندگی کا معاملہ ہو، تعلیمی بدحالی کی بات ہو یا فرقہ وارانہ فساد کا سوال ہو۔ مسلمانوں پر ہونے والے ظلم و ستم اور بے انصافی کو 'سنگم' نے بہت حد تک دور کیا۔

بیتاب صدیقی 'سنگم' کے غیر اعلانیہ ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے اسے جاری رکھنے کے لیے بہت کچھ کیا اور آخری وقتوں تک پابندی سے اس کے لیے لکھتے رہے۔ خبر، اسٹوری، فیچر، اعلانات سے لے کر اداریے تک قلم بند کیے۔ آخری دنوں میں جب آنکھ کی بینائی رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی، گھر سے نکلنا موقوف ہو گیا اور صحت ہر طرح سے جواب دینے لگی تب یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ مالک حقیقی سے جا ملے۔

لوٹ اے گردشِ ایام!

غلام سرور کے والد سے بیتاب صدیقی کے دیرینہ تعلقات تھے۔جس زمانے میں غلام سرور ضلع انگلش اسکول، مظفر پور اور ضلع ہائی اسکول موتیہاری کے طالب علم تھے اسی دوران عبدالحمید صاحب کی پوسٹنگ بحیثیت سینئر ڈپٹی کلکٹر ان علاقوں میں تھی۔ان ضلعوں سے بیتاب صدیقی کا بھی تعلق تھا۔ان کی پوسٹنگ کی وجہ سے دونوں کے تعلقات استوار ہونے لگے۔ بقول بیتاب صدیقی وہ اکثر ملاقاتوں میں غلام سرور صاحب کے تعلق سے ان کے بہتر مستقبل کے تئیں اپنی فکرمندی کا اظہار کرتے ہوئے یہ جملہ ضرور کہتے کہ ''اس کا آپ خیال رکھیے گا''، ہم نے ان سے کئی مواقع پر کہا تھا آپ کا نام یہ ضرور روشن کریں گے''۔آج وہی ہوا کہ غلام سرور کے کارنامے سے ان کا نام اتنا روشن ہوا، اتنا روشن ہوا کہ وہ برصغیر سے باہر کئی براعظموں میں اپنی سیاسی بصیرت اور حسنِ عمل سے متعارف ہوئے۔

غلام سرور کی زندگی سے متعلق ایک بیتاب صدیقی اہم انکشاف اردو دنیا کو حیرت میں ڈالنے والا ہوگا۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو کے لیکچرر کی حیثیت سے غلام سرور کی تقرری آخری مرحلے میں تھی۔ جب اس کی اطلاع تحریکی ساتھیوں کو ملی تو بڑا اضطراب پیدا ہوا کہ اگر وہ علی گڑھ چلے گئے تو پھر تحریک کا ایک اہم قائد ان سے بچھڑ جائے گا۔ چنانچہ محمد ایوب ایڈووکیٹ، جعفر امام اور شمس منیری صاحبان کو فکر دامن گیر ہوئی کہ انہیں کسی صورت سے علی گڑھ جانے سے روکا جانا چاہیے۔ یہ کام پروفیسر اختر اورینوی کو سونپا گیا جو غلام سرور کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ان کے استاذِ خاص بھی تھے۔درمیان میں بیتاب صدیقی کو لایا گیا۔ان سبھو ں نے مل کر کسی صورت سے اختر اورینوی کو اس کام پر آمادہ کیا انہوں نے آل احمد سرور سے مدد لی۔شروع میں یہ سارا کام درپردہ رکھا گیا تھا۔ بعد میں جب اس کا علم سرور صاحب کو ہوا تو انہیں بھی اس کا کوئی ملال نہیں ہوا۔ بقول بیتاب صدیقی یہ ایک بڑی قربانی تھی جس کی مثال کم سے کم بہار میں نہیں ملتی۔

اس سلسلے میں راقم الحروف نے غلام سرور سے ملاقات کر کے اس معاملے کی تصدیق چاہی تو انہوں نے برجستہ کہا:

''میں بی ایس کالج داناپور میں لیکچرر بن جاتا مگر:

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک موقع آیا تھا جہاں میرا سلیکشن فائنل مرحلے میں تھا۔اس کی اطلاع اردو تحریک کے دوستوں کو ملی تو وہ متفکر ہوئے۔ چنانچہ حضرت مولانا بیتاب صدیقی، محمد ایوب ایڈووکیٹ اور جعفر امام نے حافظ شمس الدین اور پروفیسر اختر اورینوی کو پکڑا۔اختر صاحب کے ذمہ یہ کام سپرد کیا گیا۔میری تقرری اس لیے ختم کرادی گئی کہ اس سے بہار کی اردو تحریک کمزور پڑ جاتی۔''

''آپ کا اس پر کیا ردِّ عمل ہوا؟''

''کچھ نہیں ہوا۔ مجھے یہ بہت بعد میں معلوم ہوا تو سوچا کہ اللہ میاں کو میرے لیے جو بہتر کرنا تھا وہ کیا اور اچھا کیا''۔

(باتیں 2014 ص:129-128)

بیتاب صدیقی معترف ہیں کہ غلام سرور نے بحیثیت وزیر تعلیم، اسپورٹس اور اوقاف نمایاں کارنامہ انجام دیا۔اقلیتی اسکولوں اور مدرسوں میں ایک نئی جان ڈال دی۔ان کے دور وزارت میں ان اداروں کو جتنا حق ملا اس کے بعد اب تک نہیں مل سکا۔انہیں کے دور میں وہ بہار اسٹیٹ سُنّی وقف بورڈ کے چیئرمین ہوئے۔ البتہ بہار قانون ساز اسمبلی کے اسپیکر کی حیثیت سے ان کا سب سے نمایاں کارنامہ اسمبلی میں شعبہ اردو کا قیام ہے جو ان کا ایک تاریخی قدم تھا۔ 1956ء میں بہار ریاستی انجمن ترقی اردو نے صدر جمہوریہ ہند کو تقریباً دس لاکھ دستخطوں پر مشتمل جو عرضداشت پیش کی تھی اس میں قانون سازیہ میں اردو ایک زبان کی حیثیت سے بھی شامل کیا جانا تھا۔انجمن کا یہ دیرینہ مطالبہ خود غلام سرور کے ہاتھوں 1993ء میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔

بیتاب صدیقی: ایک سخنور

بیتاب صدیقی کا گھرانا اور ماحول بالکل غیر شاعرانہ اور غیر ادبی تھا، لیکن بیتاب صدیقی کی فطرت میں سخن سنجی اور سخن فہمی سات آٹھ سال کی عمر سے ہی بدرجہ اتم موجود تھی، چنانچہ ایک موقع پر علی برادران جب ان کے یہاں آئے اور ان سے کچھ سنانے کی فرمائش کی تو انہوں نے برجستہ یہ اشعار پڑھے:

یا الٰہی کب مری افسردہ حالی جائے گی
ہند سے کب قوم نصرانی ہٹالی جائے گی
یا الٰہی بھیج دے مہدی وعیسیٰ جلد تو
یہ بلا کالی گھٹا کب سر سے ٹالی جائے گی

مدرسہ جامع العلوم مظفر پور میں طالب علمی کے دوران ان کے ایک شفیق استاذ مولانا نعمت اللہ رضی نے انہیں شعر گوئی کی ترغیب دی اور عروض کی کچھ بنیادی باتیں بتا کر ایک دن طرح دی :

لالہ کی طرح دل جو مرا داغدار ہے

جس پر انہوں نے غزل کہی۔ تضمین اور مطلع ثانی نموتاً ملاحظہ ہو:

لالہ کی طرح دل جو مرا داغ دار ہے
کیا پہلوئے رقیب میں وہ گل عذار ہے
الفت میں کوئی دوست ہے نے غمگسار ہے
اک دل تھا وہ بھی قیدیِ گیسوئے یار ہے

یہ ان کی پہلی طرحی غزل تھی جسے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے اور ایک دن انہیں لیے ہوئے اپنے عہد کے معروف بزرگ شاعر قاری عبدالمجید مضطر کے پاس پہنچے۔ مضطر مولانا نعمت اللہ کے چچا اور مدرسہ جامع العلوم کے مہتمم تھے۔ بڑے قادرالکلام شاعر تھے۔ ان کا مجموعہ ’دیوان مضطر‘ موسوم بہ ’’ریاضِ فردوس‘‘

1943ء میں معارف پریس، اعظم گڑھ سے شائع ہوا ہے۔ ان کا بہت مشہور شعر ہے:

باقی ابھی ہے رات نہ گھبرایئے حضور
پر جھاڑتے ہیں مرغ سحر بولتے نہیں

مضطر کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ چنانچہ مولانا نعمت اللہ نے بیتاب صدیقی کو بھی ان کی شاگردی میں دے دیا، مگر مصرع طرح وغیرہ دیا کرتے تھے۔ چند غزلیں کہنے کے بعد عبدالحیٔ نے اپنا تخلص بیتاب از خود منتخب کر لیا اس طرح وہ عبدالحیٔ سے بیتاب اور شیخ صدیقی کی نسبت سے بیتاب صدیقی ہو گئے۔ چونکہ طبیعت موزوں تھی اس لیے مدرسہ میں طالب علمی کے دوران کثرت سے اشعار کہتے اور مدرسہ کی بزم کے علاوہ شہر کے مشاعروں میں اپنا کلام سناتے۔ ان کی زود گوئی کی وجہ سے ان پر سرقہ کا الزام لگنے لگا۔ چنانچہ استاد مضطر نے ایک دن مدرسہ کے طلبہ اور مقامی شعرا کو جمع کر کے سبھوں کو باری باری دعوتِ سخن دیا۔ اس مسابقے میں بیتاب صدیقی سرفہرست رہے جس سے ان کے معترضین ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔ مدرسہ کی تعلیم سے فراغت کے بعد اپنی قادرالکلامی کی وجہ سے انہوں نے ریاست کے باہر کے مشاعروں میں بھی شرکت کی جن میں اتر پردیش، کلکتہ، مدراس کے علاوہ لال قلعہ دہلی کے دو تاریخی مشاعرے بھی شامل ہیں۔ بیتاب صدیقی کا کلام یا بیاض محفوظ نہیں۔ کیونکہ ان میں کچھ گاؤں میں آنے والے سیلاب کی نذر اور کچھ گھر میں ہونے والی چوریوں کی نذر ہو گیا، البتہ 1960ء سے قبل مختلف رسائل وجرائد میں شائع شدہ کلام کی تلاش وتحقیق کی جاسکتی ہے بقول بیتاب صدیقی:

’’چھٹی دہائی میں جمشید پور میں ریاستی انجمن ترقی اردو کی کانفرنس ہوئی اس میں شرکت کے بعد سے پورے بہار میں اردو کی میراث کو بچانے اور اس کو پروان چڑھانے کے لیے شعر گوئی ترک کر کے اردو تحریک سے وابستہ ہو گیا‘‘۔

(تلاش وتصنیف ص:127)

شاید یہی وجہ ہے کہ پھر ان کا کلام شاذ و نادر لوگوں نے دیکھا یا سنا ہوا البتہ وہ اپنے تخلص سے ایسے مشہور ہوئے کہ ان کے نام سے زیادہ تر لوگ ناواقف ہیں۔

ان کی غزلوں اور نظموں کے کچھ نمونے دستیاب ہوئے ہیں جو نذر قارئین ہیں:

غزلیں

﴿۱﴾

آنکھوں میں اک جہان بسانے لگا ہوں میں
ان کی نظر میں جب سے سمانے لگا ہوں میں

اک بےخودی سی آپ میں پانے لگا ہوں میں
نالوں کو کامیاب بنانے لگا ہوں میں

کرنے لگا ہے دل انہیں زلفوں سے دوستی
اب آستیں میں سانپ چھپانے لگا ہوں میں

اب ان کے احتیاط کا عالم بدل گیا
جلووں کو بے حجاب سا پانے لگا ہوں میں

بیتابؔ کچھ نہ پوچھیے سوز دروں کا حال
بجلی کو بھی چراغ دکھانے لگا ہوں

﴿۲﴾

خون جگر میں جب سے نہانے لگا ہوں میں
صحرا کو لالہ زار بنانے لگا ہوں میں

خود آ کے بجلیوں نے دیے مجھ کو مشورے
جب آشیاں چمن میں بنانے لگا ہوں میں

میرے جنون شوق کی وسعت میں کیا نہیں
ذروں کو آفتاب بنانے لگا ہوں میں

ماضی کی تلخیوں میں بھی پاتا ہوں انبساط
ناکامیوں کے داغ مٹانے لگا ہوں میں

رکھتی ہے جستجو مری بے چین حسن کو
یعنی حریم ناز میں جانے لگا ہوں میں

پھر فکر ہے کہ کیجیے تعمیر آشیاں
بجلی سے ارتباط بڑھانے لگا ہوں میں

بیتابؔ ان کے قدموں کا ہے پاس احترام
راہِ وفا میں آنکھ بچھانے لگا ہوں میں

﴿۳﴾

پھر کررہا ہوں خنجر قاتل کی آرزو
مرے لیے نئی ہے میرے دل کی آرزو

مجھ کو نہیں ہے رہبر کامل کی آرزو
ہے بھی اگر تو دوری منزل کی آرزو

گرداب بے پناہ کی ہے مجھ کو جستجو
وہ اور ہیں جو کرتے ہیں ساحل کی آرزو

راحت ہو یا کہ رنج ، خوشی ہو کہ انتشار
جاتی نہیں ہے دل سے مرے دل کی آرزو

ہنگامۂ لطافت و رنگینیِ بہار
کیا ہے اگر نہیں ہے عنادل کی آرزو

اللہ رے کمالِ جنونِ تلاش دوست
منزل پہ بھی پہنچ کے ہے منزل کی آرزو

قید قفس نصیب ہوا بھی تو کیا ہے غم
جاتی نہیں ہے دل سے عنادل کی آرزو

بیٹھے ہی بیٹھے آ گیا کیا جانے کچھ خیال
مجھ سے لپٹ گئی جو میرے دل کی آرزو

موت وحیات میں نہیں کچھ فرق دوستو!
جو اپنی جستجو ہے وہ قاتل کی آرزو

کرتا شناوری ہے وہ بحرِ محیطِ عشق
دریا کی آرزو نہ ہو ساحل کی آرزو

کیفِ بہار دیتی ہے پھر دعوتِ جنوں
پھر پوری ہوگی بند و سلاسل کی آرزو

نکلا ہے بن کے لالہ رگِ سنگ سے لہو
پامال ہوگئی جو عنادل کی آرزو

اب میں ہوں اور جراحت قلب وجگر کی سیر
بیتاب اور کیجیے قاتل کی آرزو

﴿۴﴾

درد و غم کا زمانہ مسکن ہے — زیست ناکامیوں کا مدفن ہے
یہ زمانہ جو غم کا مخزن ہے — درد وآلام کا نشیمن ہے
شمع تربت پہ کون جا کے جلائے — دشت غربت میں اپنا مدفن ہے
جھانکتے ہیں وہ اپنے چلمن سے — جلوہ گہ گویا ان کا چلمن ہے
دشمنوں نے سبق پڑھایا ہے — وہ پری رخ جو ہم سے بدظن ہے
ہم نے سمجھا تھا جس کو اپنا دوست — بن گیا کیوں ہمارا دشمن ہے
آشیاں کا خدا ہی خیر کرے — بجلیوں سے بنا نشیمن ہے
قہر ہے گردشِ زمانہ کا — امن سے دور اپنا مسکن ہے

ہے کسانوں کے گھر میں فاقہ کشی — ہر طرف جل رہا جو خرمن ہے
کیسے کہیے گا اس کو اپنا دوست — جو فسوں ساز اوپر فن ہے
قہر ہے یہ بھی اس زمانے کا — آدمی آدمی کا دشمن ہے
نہیں خالی بشر کوئی غم سے — درد وغم کا زمانہ مسکن ہے
ہر بشر درد وغم میں ڈوبا ہے — درد وغم کا زمانہ مسکن ہے
دشمنی کی ہوا چلی ہے دوست — آدمی آدمی کا دشمن ہے
درد سارے جہاں کا رکھتا ہے — اپنا سینہ جو غم کا مسکن ہے
دل کے کہنے میں آ گیا جو دوست — زندگانی کا اپنے دشمن ہے
بجلیوں نے جلا دیا ہوگا — کون جانے کہاں نشیمن ہے
ہر طرف دشمنوں کا نرغہ ہے — جس کو دیکھو ہمارا دشمن ہے
غیر کی دشمنی کی بات غلط — جان دی جس پہ، اپنا دشمن ہے
حشر سامانیوں نے گھیرا ہے — کتنا غم ناک اپنا مسکن ہے
حسن اور عالم شباب کا دور — ہر طرف زندگی کا قدغن ہے
اس زمانے کی یہ عنایت ہے — دوست بن کر وہ اپنا دشمن ہے
دوستی ان کی راس کب آئی — زندگی آپ اپنی دشمن ہے
یہ حقیقت اب آشکارا ہے — زندگی کا لباس پر فن ہے
کس نے سمجھا ہے اس حقیقت کو — زندگی رنج وغم کا مسکن ہے

بچ کے جاؤگے تم کہاں بیتاب
بجلیوں کی نظر میں مسکن ہے

(آخری غزل 1995ء)

نظمیں

﴿۱﴾

کسان

آ رہا ہے کھیت سے، ڈوبا ہے اپنے خیال میں
ضعف چہرے سے نمایاں، لڑکھڑاہٹ چال میں

رنگ چہرے کا ہے پیلا، سوکھ کر کانٹا بدن
ایک کپڑا بھی نہیں ہے ڈھانکنے کو اپنا تن

فکر سے غمناک چہرہ، غم سے وحشت ناک دل
دیکھ کر جن کو دہل جاتا ہے اب ہر ایک دل

زندگی پہ مردنی چھائی ہوئی چہرہ اداس
بوجھ ڈھوتے ڈھوتے افسردہ، پریشاں، بدحواس

محنت ورنج ومشقت، درد وغم سے چور چور
کلفتوں سے قرب ہے اور راحتوں سے دور دور

دل میں ننھے ننھے بچوں کی مسرت کا خیال
آرزو برباد، دل خستہ تمنا پائمال

خوگر رنج و الم افلاس کا مارا ہوا
ہر طرف سے، ہر طرح سے ہمتیں ہارا ہوا

جن کے دم سے ہوگیا ہندوستاں جنت نشاں
ان کی حالت دیکھ کر اب رو رہا ہے آسماں

جن کے باعث ہر طرف تھیں دودھ کی نہریں رواں
باعث آرام جاں تھیں لہلہاتی کھیتیاں

ان کے بچے بھوک کے مارے تڑپتے صبح وشام
مفلسی نے کردی گویا نیند بھی ان پر حرام

فاقہ مستی سے پریشاں در بدر مارے پھریں
تیری دنیا میں وہ یوں ناشاد ناکارے پھریں

مانگنے پر بھیک بھی ملتی نہیں ان کو یہاں
آہ اے بندِ غلامی، آہ اے ہندوستاں

اے اسیرِ رنج وغم اب صبر کی حد ہوگئی
ضبط کا یارا کہاں ہر التجا رد ہوگئی
تجھ کو رہنا ہے اگر زندہ تو کر اب کام کچھ
زندہ رہنے کے لیے دنیا میں کر اب نام کچھ

﴿۲﴾

سرمایہ داری

نیند سے بیدار ہو ہشیار بن
لعنتِ سرمایہ داری کے لیے تلوار بن

کر بلند اب انتقامِ جوش کو خود کو جھنجھوڑ
خون کی ندیاں بہا سرمایہ کی گردن مروڑ

آ رہا ہے انقلاب اور دے رہا ہے یہ پیام
ٹوٹنے والا ہے اب سرمایہ داری کا نظام

﴿۳﴾

سہرا

نظر آتا ہے جو تصویرِ محبت سہرا
ہے چھپائے ہوئے دامن میں محبت سہرا

رخِ نوشاہ سے تھوڑی سی تجلی لے کر
بن گیا صلِّ علیٰ گوہرِ عظمت سہرا

ہو مبارک تجھے نوشاہ عروسی راتیں
ہو مبارک تجھے پیغامِ محبت سہرا

اللہ اللہ یہ خوشی عیش و طرب اور نشاط
آج ہے کون و مکاں میں تری شہرت سہرا

شرف دولہا سے بلندی ہوئی سہرے کو نصیب
کیوں نہ کہیے کہ یہ ہے پیکرِ عزت سہرا

تحفے نوشہ کے لیے لائے ہیں سب آج بہت
میں بھی آیا ہوں لیے نذرِ عقیدت سہرا

رباعی

مذہب نے بدل ڈالی ہیں اپنی راہیں
انسان پھر انسان کو کیونکر چاہیں
ہے خون سے ہولی کہیں ہے فکر فساد
پھر کون سنے ملک کی لاکھوں آہیں

بیتاب صدیقی بحیثیت صحافی

بیتاب صدیقی ایک شاعر، صحافی اور ادیب تھے۔ اردو، فارسی اور عربی زبانوں پر یکساں درک رکھتے تھے۔ مختلف اصنافِ ادب اور سخن میں ہونے والے نت نئے تجربات وامکانات سے کما حقہٗ واقف تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیوں پر بھی سیر حاصل نگاہ تھی اور جدید شاعری کے رجحانات سے بھی آشنا تھے۔ مگر اپنی شخصیت کے مذکورہ تمام اوصاف وکمالات کو انہوں نے اپنے 'مشن اردو' میں گم کر دیا تھا۔ شاید یہی وجہ ہوئی کہ ان کی زندگی یا اس کے بعد ایک شاعر، صحافی اور ادیب کی حیثیت سے ان کے کارناموں کی نہ تو کوئی قدر و قیمت متعین کی گئی، نہ کسی نے ان کی ادبی خدمات کو اپنے دائرہ مطالعہ میں لانے کی زحمت اٹھائی۔

بیتاب صدیقی نے سات آٹھ سال کی عمر سے باقاعدہ میدانِ سخن میں قدم رکھ دیا تھا۔ مدرسے کی ابتدائی تعلیم کے دوران ان کے کلام مشاعروں میں بڑے ذوق وشوق سے سنے جاتے اور قاری عبدالمجید مضطر کے حلقہ تلامذہ میں وہ قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کی زود گوئی کی وجہ سے ان پر سرقے کا الزام لگا، مگر بہت جلد نکتہ چینوں کو منہ کی کھانی پڑی۔ اردو تحریک کی گوناگوں مصروفیات نے 1959ء کے بعد بیتاب صدیقی کی شاعرانہ شناخت چھین لی مگر ان کے تخلص نے انہیں حیاتِ جاودانی عطا کی۔ شعر گوئی کی علت بستر مرگ پر بھی اپنی جولانی طبع دکھائے بغیر نہیں رہ سکی۔ زندگی کے بالکل آخری پڑاؤ پر ایک شاعر کی حیثیت سے پھر ان کی نشاۃ ثانیہ ہوئی۔ وہ اشعار کہتے رہے اور بستر کے نیچے اور ادھر اُدھر کاغذات میں دباتے رہے۔ 1995ء میں ان کی کہی ہوئی ایسی ہی غزل ابھی حال میں دستیاب ہوئی ہے جو ان کی سخنوری کے باب میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

بیتاب صدیقی سخنوری کے ساتھ زلف صحافت کے بھی اسیر ہو چکے تھے، کیوں کہ صحافت ان کی ضرورت تھی، یہی اردو تحریک پٹنہ سے کو عوام الناس سے لے کر اربابِ اقتدار تک پہنچانے کا مؤثر ذریعہ بھی تھا۔ انہوں نے اپنی ادارت میں پٹنہ سے 1947ء میں ہفتہ وار 'مؤمن دنیا' اور 1950ء میں ہفتہ وار

'طوفان' جاری کیا۔ چند برسوں بعد یہ دونوں ہفتہ وار بند ہوگئے۔ 1953ء سے جب غلام سرور کا اخبار 'سنگم' پٹنہ منظر عام پر آنے لگا تو اس کی اشاعت کے پہلے دن سے تادم مرگ وہ اس کے ایک جزو لاینفک بنے رہے۔ انہوں نے اداریے سے لے کر خبریں، بیانات، اعلانات غرض جو بھی مقتضائے حال تھا لکھتے رہے اور ان کی اشاعت 'سنگم' میں ہوتی رہی۔ 'سنگم' کی قلمی معاونت کے علاوہ اسے جاری رکھنے کے لیے اس کے بانی و مدیر غلام سرور کے علاوہ بیتاب صدیقی نے بھی ہر وہ اقدام کیا جو وہ کر سکتے تھے۔ خصوصیت کے ساتھ جب غلام سرور زیر حراست رہتے یا شہر سے باہر ہوتے تو 'سنگم' کو اس کی پالیسیوں کے مطابق جاری رکھنے میں بیتاب صدیقی کی گراں قدر خدمات اخبار کے شامل حال رہی۔ اس کے لیے انہیں جیل بھی جانا پڑا اور متعدد مقدمات کا سامنا بھی کیا، لیکن کبھی ان کے پایہ استقلال میں لرزش نہیں آئی۔ اردو تحریک کی دشوار گزار راہوں میں جس طرح غلام سرور اور بیتاب صدیقی اپنی زندگی کے آخری لمحات تک شانہ بشانہ رہے اسی توازن کے ساتھ دونوں کا صحافتی سفر بھی ساتھ ساتھ جاری رہا۔ بیتاب صدیقی نے اپنی صحافت کے ذریعہ جہاں اردو تحریک کو اوّلیت دی وہیں جمہوری اقدار کی پاسداری اور فرقہ وارانہ فسادات کے علاوہ ہر طرح کے ظلم و ستم اور ناانصافی کے خلاف ان کا قلم چلتا رہا۔ حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے پیشہ وارانہ برادریوں کو درپیش مسائل کے خلاف وہ ہفتہ وار 'طوفان' اور 'مومن دنیا' سے لے کر 'سنگم' تک میں اپنی آواز نہ صرف بلند کرتے رہے بلکہ بار بار وفود کی شکل میں حکومت سے مل کر ان کے مسائل کا حل بھی پیش کرتے رہے، جو بحیثیت صحافی یہ ان کی ایک اضافی خوبی تھی۔

بیتاب صدیقی میدانِ عمل کے آدمی تھے اس لیے ادب سے زیادہ انہیں صحافت راس آئی کیوں کہ انہیں اپنی باتوں کو روزانہ دوٹوک انداز میں رکھنے کا جو ملکہ حاصل تھا اس کے لیے اخبار ہی ایک مؤثر ذریعہ تھا۔ چنانچہ کسی بھی موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے ان کی زبان ہمیشہ عام فہم اور ترسیل و ابلاغ سے بھرپور ہوتی تھی اس میں سماج کے سبھی طبقوں کو جہاں اپیل کرنے کی صلاحیت تھی وہیں حکومت بھی ان پر کان دھرنے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ ان کی صحافتی جرأت مندی، بے باکی، مسائل کو پیش کرنے کا ہنر اور حالاتِ حاضرہ کے تقاضوں کے تحت پیہم ہنگامی موضوعات پر قلم اٹھانے کا اپنا ایک مخصوص اسلوب تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بیتاب صدیقی کی بنائی ہوئی خبریں ہوں یا اسٹوری، بیانات ہوں یا اعلانات ان میں جہاں عوام اپنے دل کی دھڑکنیں محسوس کرتے وہیں حکومت وقت بھی ان کی نوٹس لیتی رہتی تھی۔

بیتاب صدیقی میں ایک دیدہ ور اور کہنہ مشق صحافی کی تمام تر خوبیاں کمال درجہ کی حد تک موجود

تھیں۔ چونکہ حالاتِ حاضرہ پر ان کی نگاہیں بڑی عمیق تھیں اس لیے ان کی تحریریں ہمیشہ مقتضائے حال ہوا کرتی تھیں۔ وہ میدانِ عمل کے شہسوار اور زمینی حقائق سے وابستہ تھے۔ لہٰذا انہوں نے صحافت کے توسط سے ہر دور میں انسانوں کے مسائل کی بہترین وکالت کی اور انہیں مثبت انداز میں ایوانِ اقتدار تک پہنچانے کی حتی المقدور کوششیں کیں۔

بیتاب صدیقی کی صحافتی خدمات کے مختلف ادوار اور عناوین ہیں جن سے اب تک چشم پوشی کی گئی ہے۔ ''مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ترجمان 'نوجوان' سے لے کر 'مومن دنیا'، 'طوفان' اور 'سنگم' کی فائلیں صحافت کے شعبہ میں ان کی شعور و آگہی کی دستاویز ہے۔ مگر افسوس کہ وہ فائلوں کے بوجھ تلے قصہ پارینہ کی مصداق بنی ہیں اور ایک دیدہ ور صحافی کی حیثیت سے بیتاب صدیقی کا نام لیوا آج کوئی نہیں۔ یہاں ہفتہ وار 'مومن دنیا'، ہفتہ وار 'طوفان' اور روزنامہ 'سنگم' سے ان کے تین اداریوں کا متن بطور نمونہ درج ہے:

جمہوریہ ہند کا پہلا جشن سالگرہ

26 جنوری 1951ء آزاد جمہوریہ کی پہلی سالگرہ کا دن' آزاد ممالک کی صف میں شامل ہوئے پورا ایک سال ہو گیا۔ آج ہی کے دن 30ء میں کانگریس نے ملک کی آزادی کی تجویز منظور کی تھی۔ آج ہی کے دن عوامی نمائندوں کے بنائے ہوئے دستور کا پورے ملک پر نفاذ ہوا۔ اس طرح ہم نے اپنے طویل سفر کا کافی فاصلہ طے کر لیا ہے۔ آج ہم اپنے آزاد بھارت جمہوریہ کا جشن سالگرہ منا رہے ہیں۔ آزادی کا نیا سال ہمارے لیے امیدوں اور کامرانیوں کا مژدہ جانفزا لایا ہے۔ آج نہ صرف اونچے اونچے محلوں میں بلکہ خس پوش مکانوں میں بھی مسرت کے فوارے نظر آ رہے ہیں۔

مگر مسرت کے ان خوشگوار لمحوں میں رنج و غم کی تلخیاں بھی شامل نظر آتی ہیں اور اس سہانے وقت میں جب آہنی عزم و استقلال کے مالک پیکر تدبیر سردار پٹیل کی یاد آتی ہے تو دل بے چین ہو جاتا ہے جو ہماری جنگ آزادی کا ہوشیار سپہ سالار تھا۔ جس نے حصول آزادی سے پہلے بھی اور بعد بھی ہر نازک موقع پر ہماری رہنمائی کی۔ جو مہاتما گاندھی کے بعد ان کی تعلیمات کا مبلغ اور ہمارے محبوب وزیر اعظم پنڈت نہرو کا دست راست تھا۔ اس جشن جمہوریہ کے موقع پر ہم سردار پٹیل کی بے حد کمی محسوس کر رہے ہیں، جن کی رہنمائی اور معیت میں ایک طویل کشمکش سے گزر چکے ہیں۔ اور جن کی کوششوں سے بٹوارے کے بعد بھی بھارت کی قومی وحدت محفوظ رہی۔ بھارت کی تاریخ میں تقریباً ایک ہزار سال کے بعد یہ دن آیا ہے کہ اس کے زیادہ تر حصے متحد ہو سکے۔ اب اس کی مضبوطی اور از سر نو تنظیم کی کاروائی بھی تیزی سے ہونی

چاہیے۔ہمیں اب تعمیری نگاہ سے سوچنا چاہیے اور اپنی ساری اہلیت اور ذرائع کو قومی کاموں کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔

آج ہم حالات کا جائزہ لے سکتے ہیں جب کہ ہم اپنا آئین بنانے، آزاد سیاسی فیصلے کرنے اور مفادملی کے مطابق اقتصادی پالیسی طے کرنے کی پوری آزادی رکھتے ہیں۔اس آئینے میں جب ہم اپنے ملک کا خدوخال دیکھتے ہیں تو اپنے رہنماؤں کی یک سالہ مساعی اور خدمات کا قدرے اندازہ لگ جاتا ہے جوانہوں نے انتہائی دشوار مرحلوں میں بھی سرکاری ذرائع کی مدد سے فلاح عامہ کی خاطر انجام دی ہیں۔ گزشتہ سال ملک کے لیے نحوست اور مصیبت کا سال تھا جب کہ اعلان جمہوریہ کے فوراً بعد ہی الم ناک حادثات شروع ہوگئے۔مشرقی بنگال اور مغربی بنگال کے حادثے کچھ اس طرح بھیانک بن کر آئے کہ اہالیان ملک کے دل دماغ پر کافی اثر انداز ہوئے۔اور خستہ حال پناہ گزینوں کا لامحدود قافلہ ہماری ہستی کے لیے اندرون ملک ایک بہت بڑا خطرہ بن گیا۔لیکن ہمارے رہنماؤں نے نہرو لیاقت معاہدے کو کامیاب بنا کر دشواریوں پر قابو پالیا۔اسی طرح آسام کا قیامت خیز زلزلہ، بہار میں اجناس کی کمی، جو بھیانک قحط کی شکل اختیار کر چکی تھی۔انتہائی صبر آزما اور حوصلہ شکن واقعات تھے جن پر آہستہ آہستہ قابو پانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

اعلان جمہوریہ کے بعد گزشتہ سال ایک آزاد قوم کی حیثیت سے ہمارا تجرباتی دور تھا۔اس دور میں ہمارے رہنماؤں نے جو کارنامے انجام دیے ہیں اس نے دنیا کی نظروں میں ہندوستان کے وقار کو بہت اونچا کر دیا ہے۔قوم خود سے بنتی نہیں ہے بلکہ بنائی جاتی ہے اور قوم کو بنانے کے لیے تعمیری کاموں کی ضرورت ہوتی ہے۔اس اصول کے پیش نظر اپنے معاشی، اقتصادی اور سیاسی مسائل کے حل کرنے میں ملک کے رہنماؤں کے زیر سرکردگی قوم نے جس ارادہ اور ہمت سے کام لیا ہے اس کا اندازہ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔

بھارت کی خارجہ پالیسی:

مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں جنگ آزادی جس طرح عدم تشدد کے اصول پر لڑی گئی اس نے بھارت کے متعلق دنیا کے لوگوں میں حسن عقیدت کا ایک عام جذبہ پیدا کر دیا ہے۔اور خاص کر ایشیائی ہمسایہ ممالک، جن سے ہمارے کلچرل تعلقات وابستہ ہیں وہ ہم سے بڑی امیدیں وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ آج جبکہ دنیا تقریباً دو حصوں میں بٹ چکی ہے، طاقت وفریب کی حکمرانی اپنا اثر ورسوخ

وسیع تر کرتی جارہی ہے۔ہمارے وہ رہنما جن کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ڈور ہے، ہمیں کس طرف لے جارہے ہیں اور اپنی عالمی پالیسی کس ڈھنگ پر بنا رہے ہیں۔اس مرحلہ پر ہمیں یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے کہ بھارت نے حصول آزادی کے بعد ایک سال کی مدت میں بڑی حد تک اپنے کو طاقت کی سیاست سے علاحدہ رکھا ہے۔مہاتما گاندھی کے بتائے ہوئے اصول پر وزیراعظم پنڈت نہرو کی قیادت میں اپنی خارجہ پالیسی کچھ اس ڈھنگ سے چلائی ہے کہ آج اقوام عالم خراج تحسین ادا کرنے پر مجبور ہیں۔ اس کے ثبوت میں پچھلے چند مہینوں کے دوران میں بھارت سرکار نے جنگ کی طرف بڑھتے ہوئے رجحانات کو روکنے کے سلسلے میں جو اقدامات کیے ہیں پیش کئے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ چین یا کوریا، تبت یا پاکستان کے متعلق ہند کی خارجی حکمت عملی کا واحد مقصد عالمی جھگڑوں کو پرامن طور پر حل کرنا رہا ہے۔ اوراب دنیا کے لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ بھارت کے تمام اقدامات کے پس پشت یہ شدید خواہش کارفرما رہی ہے کہ کس طرح دنیا میں امن قائم رکھنے میں مدد کی جائے۔

لیکن بھارت اس ترقی کے دور میں اقوام عالم کی پہلی صف میں اس وقت تک پائدار جگہ نہیں حاصل کرسکتا جب تک اپنے اندرونی مسائل کو خوش اسلوبی سے حاصل نہ کرلے۔ بھارت کے عوام اس وقت تک قیام امن کے متعلق عالمی مساعی کو عملی طور سے اپنا نہیں سکتے جب تک وہ اپنی زندگی کے ضروری مسائل پر قابو نہیں حاصل کر لیتے۔اس حیثیت سے جب ہم اصلاح وترقی کے سرکاری منصوبوں کا ایک سرسری جائزہ لیتے ہیں تو اس مختصر سی مدت میں بھارت کی ترقی اور خوشحالی کے منصوبے خوش آیند اور پرامید معلوم ہوتے ہیں۔

صنعتی واقتصادی ترقی:

اعلان جمہوریہ کے ایک سال کی مدت میں بھارت نے صنعتی پیداوار میں کافی اور کامیاب ترقی کی ہے۔ چنانچہ فولاد، سیمنٹ، کوئلہ، برقی سامان، گندھک کا تیزاب، کاسٹک سوڈا، ڈیزل انجن، سلائی کی مشین وغیرہ کی صنعتوں نے پیداوار کے اضافے میں نمایاں ترقی دکھلائی ہے اور ان میں سے بعض مصنوعات خود کفیل ہونے کی مقدار سے بھی زیادہ تیار ہوئی ہیں۔ ہاں کپڑے اور سوت کی پیداوار کے اضافے میں نمایاں ترقی دکھلائی ہے اور ان میں سے بعض مصنوعات خود مکتفی ہونے کی مقدار سے بھی زیادہ تیار ہوئی ہیں۔ہاں کپڑے اور سوت کی پیداوار میں البتہ کمی واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ 1949ء کے مقابلہ میں کپڑے کی پیداوار میں 26 کروڑ 20 لاکھ گز اور سوت کی پیداوار میں 19 کروڑ 10 لاکھ گز پونڈ کی کمی

ہوئی ہے،جس کی خاص وجہ روئی کی قلت ہے۔اورعوام کی ہمدردی کا دم بھرنے والے سوشلسٹ کارکنوں کی ان کوششوں کو دخل ہے جس کے باعث کافی ہڑتالیں ہوئیں،جس میں مزدوروں کی غیر حاضری سے بہت بڑااثر پڑا۔چنانچہ صرف ان ہڑتالوں کے باعث 20 کروڑ 30 لاکھ گز کپڑے اور 5 کروڑ 30 لاکھ پونڈ دھاگے کا نقصان ہوا۔اس کمی کو پورا کرنے کے لیے تجربہ کارلوگوں پر مشتمل ایک ڈیولپمنٹ کمیٹی بنائی گئی ہے۔نیز صنعتی مزدوروں سے رابطہ قائم کیا جارہا ہے۔

اس کے علاوہ ملک کی ترقی کے بڑے بڑے صنعتی منصوبوں پر عمل ہو رہا ہے۔ چنانچہ انجن اور جہاز سازی جیسی صنعت کو ترقی دینے کی پرزور کوشش ہورہی ہے۔

حکومت کی تجارتی پالیسی بھی بہت زیادہ کامیاب رہی ہے۔ چنانچہ 49-1948ء میں بھارت کی تجارت کا مخالفانہ توازن 3 ارب 32 کروڑ 90 لاکھ روپیہ تھا۔لیکن پچھلے سال حکومت نے اپنی تجارتی پالیسی میں جوزبردست تبدیلی کی اس کے باعث 50-1949ء میں بڑے حوصلہ افزا نتائج پیدا ہوئے۔اوراکتوبر 1950ء تک 34 کروڑ 66 لاکھ روپیہ کا موافقانہ توازن حاصل کیا گیا۔اس موافقانہ توازن کی ایک دوسری وجہ بھارتی سکہ کی قیمت پونڈ،اسٹرلنگ کی قیمت کے مطابق کم کر دینے کی پالیسی بھی ہے۔اوراس تخفیف کا ایک دوسرا فائدہ یہ بھی ہوا ہے کہ ہند کے برآمد کی صلاحیت بہت بڑھ گئی اور تجارتی توازن کا رجحان یکسر الٹ گیا۔ چنانچہ ڈالر کے علاقوں میں 56 فیصدی اور کمیاب سکہ کے علاقوں کے ساتھ 33 فیصدی برآمد کا اضافہ ہوا۔اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ریزروڈالر کواور بڑھا لیا گیا۔اسی طرح ریزرو اسٹرلنگ میں معتدبہ کمی ہوتی جارہی تھی مگراس پالیسی کی بدولت تقریباً آٹھ کروڑ اسٹرلنگ کا اضافہ ہوا ہےاور برطانیہ کے ساتھ برآمد کا توازن کافی بڑھ گیا ہے۔

لیکن معیشت کی تنگ حالی کے اس دور میں یہ نتائج ابھی زیادہ حوصلہ افزانہیں ہیں۔ ملک کے سامنے اس وقت سب سے بڑا مسئلہ غلہ کی کمی اور غذائی اجناس کے بحران کا ہے۔ بھارت ایک زراعتی ملک ہونے کے باوجود قلت اجناس کا شکار ہے۔اس دشواری پر قابو پانے کے لیے حکومت چند سالوں سے متواتر کوشش کررہی ہے۔ چنانچہ 29 جون 49ء کووزیراعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو نے فرمایا تھا کہ حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ 1951ء کے آخر تک ہمیں اتنا اناج پیدا کرنے کے قابل ہونا چاہیے تا کہ ملک کے ہر باشندہ کو غذا میسر ہوسکے،لیکن 1951ء آگیا مگر یہ مسئلہ ہنوز بھیانک ہی نظر آرہا ہے۔ گرچہ حکومت نے غلّہ پیدا کرنے کی مختلف اسکیموں پر کافی توجہ کی اور کافی روپیہ صرف کیے نتیجے کے طور پر منصوبے کے اعتبار

سے 95 فیصدی کامیابی ہوئی اور تقریباً 26 لاکھ ٹن غلہ زیادہ پیدا کیا گیا۔مگر حکومت کی ساری کوششوں پر قدرتی ناگہانی آفات نے پانی پھیردیا ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ صدر جمہوریہ کی اپیل پرعوام لبیک کہہ کر سرکاری منصوبوں کی تعمیل میں اشتراک عمل کریں۔

آزادی کے بعد ہی اجڑے ہوئے اور لٹے ہوئے انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو ملک کے اندر جگہ دینی پڑی جو ہر طرح ہماری اعانت کے محتاج تھے۔مگر ان کی اعانت کی بجائے چند مفاد پرست جماعتوں نے انہیں اپنا آلہ کار بنایا جس کے باعث ان پناہ گزینوں کی آبادکاری کا مسئلہ کافی دشوار اور طویل ہوگیا۔پھر بھی اس موقع پر تمام دشواریوں کے باوجود حکومت نے قابل ستائش کام کیا ہے۔جس کا قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ آزاد جمہوریہ کی آٹھ ریاستوں میں 14 نئے شہر جدید طرز کے زیرتعمیر ہیں جن میں مجموعی طور پر لاکھوں بے گھر افراد آباد ہوں گے۔

ضرورت ہے کہ کسٹوڈین کی گرفت کو حکومت ڈھیلی کرے،تا کہ بے خانماں مسلمان گھرانے اپنے وطن میں پرامن زندگی گزار سکیں۔

نوزائیدہ جمہوریہ کی یک سالہ مساعی یہ رہی ہے کہ عوام کو ہر شعبہ زندگی میں قابل رشک ترقی کے مدارج پر پہنچادے۔مگر یہ سب کچھ اسی وقت ہوسکتا ہے کہ ملک میں امن قائم ہو۔لوگوں کے دل ودماغ تنگ نظری سے پاک ہوں۔ ہر شخص میں تعاون اور شہری اسپرٹ موجود ہو۔اپنے خانگی معاملات میں غیر مذہبی معیار برقرار رکھتے ہوئے رواداری،خلوص اور خیر سگالی کا رویہ اختیار کریں اور ملک سے وفاداری کی ذمہ داری محسوس کریں۔

زندہ باد آزاد بھارت جمہوریہ! (ہفتہ وار'مومن دنیا'26 جنوری 1951ء)

مہاسبھا اور مسلمان:

پنڈت جواہر لال نہرو وزیراعظم ہند جمہوریہ نے پچھلے ہفتہ لکھنؤ کے ایک عام جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کمرڈبی ودیگر جگہوں کے فسادات اور ہند کے عام فرقہ وارانہ حالات کا تذکرہ کیا اور اس موقع پر آپ نے یہ بھی انکشاف فرمایا کہ ہندومہاسبھا جارحانہ فرقہ واریت کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ملک میں اکثر جگہ جوفسادات ہورہے ہیں ان فسادات کا ذمہ دار مہاسبھا کو ٹھہراتے ہوئے آپ نے یہ بھی فرمایا کہ یہ ہندومہاسبھا کی پالیسی ہے کہ''وہ ہرجگہ فرقہ وارانہ فسادات کے ذریعہ ہندو میں مسلمانوں کے خلاف

نفرت کا جذبہ پیدا کر کے ان پر اپنا اثر و رسوخ جمائے۔'' ورنہ فسادات کے سلسلے میں مسلمانوں پر اشتعال انگیزی کے جو الزامات لگائے جاتے ہیں یہ بالکل غلط ہیں۔ اس دور میں کوئی مسلمان بھی اس طرح کی کوئی ایسی حرکت کبھی نہیں کر سکتا جس سے پورے اقلیتی فرقہ پر آفت آئے اور خود اس کی جان و مال کے نقصان کا باعث ہو۔

پنڈت جواہر لال نہرو کے اس انکشاف حقیقت سے مہا سبھا کی ٹولی میں بوکھلاہٹ پھیل گئی ہے اور وزیر اعظم ہند کی یہ سبھی بات اتنی کڑوی لگی ہے کہ مہا سبھا کے ذمہ دار رہنما نہ صرف منہ بنائے پھر رہے ہیں، بلکہ ہندو عوام میں پنڈت نہرو کے خلاف جس طرح برہمی پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں اس سے اس حقیقت کا سراغ بھی ملتا ہے کہ وہ لوگ اپنا دماغی توازن تک کھو چکے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مہا سبھا کے صدر ڈاکٹر کھارے جو بہار کے مختصر دورہ پر آئے ہوئے ہیں مختلف جگہوں کی تقریریں اور بیانات میں متضاد باتیں بیان کرتے نظر آرہے ہیں، جس میں غصہ، بدگمانی، انتقام اور جارحانہ عزائم کی جھلک تو صاف نظر آتی ہے، جس میں مہا سبھا کو فرقہ وارانہ تنظیم شمار کرنے سے انکار ہے، جس میں ہندوؤں کو کانگریس اور حکومت کے خلاف بھڑکانے کی کوشش نمایاں ہے۔ اسلام اور اسلامی ممالک کے خلاف غصہ اور اشتعال بھی ہے، مگر سنجیدگی، سچائی اور حقیقت پسندی کا ہر جگہ فقدان ہے۔ ڈاکٹر کھارے نے ایک ہی سانس میں ہندی، ہندو، ہندوستان کا فرقہ وارانہ نعرہ بھی لگایا ہے۔ نواکھالی کا انتقام لینے والے بہاری ہندو سورماؤں کو بدھائی اور مبارکباد بھی دی ہے۔ اکھنڈ بھارت ہندو راج کے قیام کا مستحکم اظہار عزم بھی کیا ہے۔ کانگریسی حکومت کی ناانصافی کی شکایت بھی کی ہے۔ مگر ٹیپ کا بند یہ ہے کہ مہا سبھا کے ہندو راج میں مسلمانوں کے ساتھ منصفانہ سلوک کا اعلان بھی کیا ہے اور اسی کے ساتھ جو مسلمان پنجاب میں پچھلے دنوں مہا سبھا کے گرگوں کے ہاتھ مارے گئے ان کی موت کو کتے کی موت سے تعبیر کیا ہے اور نہایت طنز آمیز لہجہ میں یہ بھی کہا ہے کہ کانگریس نے انہیں بچا کیوں نہ لیا اور انہیں کیوں مرنے دیا؟ گویا مہا سبھا کے لیڈروں کے نزدیک مسلمانوں کی حیثیت ایک ایسے مالِ غنیمت کی ہے جس پر صرف مہا سبھا والوں کا حق پہنچتا ہے کہ وہ جس طرح انہیں چاہیں رکھیں اور جو سلوک ان کے ساتھ چاہیں برتیں۔ اس میں کسی کو دخل نہیں دینا چاہیے اور اب ہند میں صرف مہا سبھا کو حکومت کرنے کا حق اس لیے حاصل ہے کہ کانگریس مسلمانوں کے ساتھ منصفانہ سلوک برتنا چاہتی ہے اور مہا سبھا جس انصاف کے ساتھ مسلمانوں پر حکومت کرے گی، اس حکومت میں پنجاب جیسے روح فرسا انسانیت سوز واقعات دہراتے وقت کوئی مانع نہ آسکے گا۔ ع

گر یست عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

مہا سبھا کے رہنماؤں کو معلوم ہونا چاہیے کہ نہ صرف مسلمان بلکہ ہندوستان کی ہر اقلیت کے افراد مہا سبھا کے عزائم اور ارادوں کو بھانپ چکے ہیں اور ''بخشو بی، بلی، چوہا، لنڈورا ہی جیے گا'' ہند کی کوئی اقلیت بھی مہا سبھا کی تیار کی ہوئی جنت میں داخل ہونا کبھی بھی گوارہ نہیں کرے گی اور نہ اس کا کوئی فرد مہا سبھا کی ابلیسیانہ پالیسی اور اس کے ناپاک مقاصد کی ہمنوائی کبھی کر سکے گا، اس لیے ڈاکٹر کھارے اور مہا سبھا کے دیگر رہنماؤں کو مسلمانوں پر تخویف و تخریش کے ڈورے نہ ڈالنا چاہیے:

کس نماید پذیر سایہ بوم
ور ہما از جہاں شود معدوم

رہا کانگریس اور حکومت کے متعلق مہا سبھا کی برائی کے ساتھ اظہار خیال کرنا تو اس میں کوئی شک نہیں کہ کانگریس اور کانگریسی حکومت دونوں میں خامیاں ہیں۔ مگر ان خامیوں کے باوجود ہند کے عوام مہا سبھا کی فسطائی ذہنیت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اور وہ بھی مہا سبھا کے رہنماؤں کے چکمے اور جملے بازیوں میں نہ آئیں گے، اس لیے کہ ہند کے عوام یہ جانتے ہیں کہ مہاتما گاندھی جو اس دور میں انسانیت کے تنہا ایک سچے دوست اور دنیا کے لیے سچائی کے مینار تھے، انہیں کی مخلصانہ کوششوں اور انہیں کی بے پایاں قربانیوں کی بدولت ہند کو آزادی ملی ہے اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مہاتما گاندھی کی ناخدائی نے ہی ہماری جنگ آزادی کے سفینہ کو ساحل تک جلد پہنچایا، ورنہ غلامی کی بیڑیاں خدا جانے کب تک ہمارے پیروں میں بندھی رہتیں۔ مگر حیرت اور افسوس یہ ہے کہ ایسے مخلص اور جانثار شخصیت کو ہندوستان کی آزادی کے مخالف اور فسادی رہنما آج نکما اور مطلب پرست کہیں اور ان کے انسانیت دوست فلاسفی کو غلط ٹھہرائیں اور انہیں مسلم پرستی کا طعنہ دیں، جنہوں نے ہندوؤں کو نئی زندگی، نیا حوصلہ اور عزم بخشا اور ہند کو آزاد قوموں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا۔ اگر مہاتما گاندھی نکما اور مطلب پرست ہو سکتے ہیں تو ڈاکٹر کھارے سے بڑھ کر احسان فراموش اور ملک کا دشمن کون ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر کھارے کو نظر بندی کے قانون سے سخت شکایت ہے۔ مگر حکومت اس قانون کا بہترین اور صحیح مصرف لے سکتی تھی تو وہ صرف اس طرح کے ڈاکٹر کھارے جیسے فتنہ پرور لوگوں پر سب سے پہلے اس آئین کا استعمال کرتی اور ہم حکومت سے اس موقع پر مطالبہ کریں گے کہ وہ جلد مہا سبھا پر پابندی عائد کرے ورنہ اس کے رہنماؤں کی تازہ سرگرمیاں ملک کی تباہی کا باعث بننے والی ہیں۔

اس موقع پر ہم مسلمانوں سے درخواست کریں گے وہ مہاسبھا اور اس جیسے دیگر فرقہ پرستوں کی سرگرمیوں سے مرعوب نہ ہوں، بلکہ ملک کے موجودہ حالات کو اپنا ہمنوا بنانے کے لیے ملک کی غیر مذہبی جمہوریت کو تقویت بخشیں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ خود اعتمادی کے ساتھ کانگریس میں شریک ہو جائیں۔ اس طرح ملک کی امیدوں کے تنہا مرکز شری جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہند کے ہاتھ کو مضبوط کریں۔ مہا سبھا کی تازہ سرگرمیوں کا تقاضہ ہے کہ اقلیت کے افراد بیدار ہوں اور ملک کی خدمت کے جذبے کے ساتھ کانگریس کو مضبوط بنائیں۔ (ہفتہ وار ’طوفان‘ 3/مارچ 1951ء)

بہار میں اردو تحریک:

(10 جنوری 1987ء کو روزنامہ ’سنگم‘، پٹنہ کی سلور جبلی تقریبات کے موقع پر بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے صدر کی حیثیت سے روزنامہ ’سنگم‘، پٹنہ کے لیے بیتاب صدیقی کا تحریر کردہ اداریہ)

یہ انتہائی مسرت کی بات ہے کہ بہار میں اردو تحریک کا ترجمان اور روحِ رواں جریدہ روزنامہ ’سنگم‘ 10 جنوری 1987ء کو 25 سال کی مدت پوری کر رہا ہے۔ اس لیے ادارہ ’سنگم‘ کی پچیسویں سال گرہ کی جشن منانے کا سبھوں نے فیصلہ کیا ہے۔ ’سنگم‘ ہفتہ وار جریدہ کی حیثیت سے اکتوبر 53ء میں جاری ہوا تھا۔ پہلے ’سنگم‘ کی اشاعت ادارہ ’سنگم‘ کے بانی و ایڈیٹر غلام سرور کے آبائی مکان دانا پور سے شروع ہوئی تھی۔ پھر یہ چند برسوں میں منتقل ہو کر پٹنہ لالہ زار منزل میں آ گیا۔ ہفتہ وار ’سنگم‘ کے اجرا کو بھی 34 برس ہو گئے اور اس مدت میں ’سنگم‘ ہفتہ وار اور روزنامہ نے جو قومی و ملی خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں اور صحافتی میدان میں تنہا ایک عرصہ تک نہ صرف اردو تحریک کی علمبرداری کی ہے بلکہ قوم وملت اور وطن کے ہر کٹھن مرحلوں میں وہ کام آیا ہے۔ اس کا یہ کارنامہ کبھی فراموش نہیں کی جا سکتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ’سنگم‘ نے زبان اردو کے تحفظ و بقا کی جدوجہد کو مضبوطی کے ساتھ سہارا دیا ہے تو دوسری طرف مسلمانوں کی تعلیمی، تنظیمی، معاشی، اقتصادی اور ملی و مذہبی محاذ پر بے شمار خدمات انجام دے چکی ہے۔ اس لیے اردو صحافت کی تاریخ میں اپنا ایک روشن باب قائم کر چکا ہے اور جناب غلام سرور ’سنگم‘ کے ذریعہ قومی خدماتِ جلیلہ کے معاوضے میں تین چار مراتب (سات مرتبہ) حکومت کے عتاب کے شکار ہو کر قید خانوں میں زندانی رہ چکے ہیں اور اخبار پر حکومت کی طرف سے 39 مقدمات قائم ہو چکے

ہیں۔ دو یا تین بار اس کی ضمانت بھی ضبط ہو چکی ہے۔

غرض یہ کہ آزادی کے بعد نہ صرف بہار بلکہ پورے ہندوستان کا واحد اردو جریدہ ہے جس نے قوم وملت کی خاطر بے شمار خدمات پیش کی ہیں اور اس کے بانی ایڈیٹر غلام سرور نے ہنسی خوشی کے ساتھ جیل کے سرد و گرم موسم کو کاٹا ہے تو اردو عوام کے تعاون سے ضمانتوں کی رقم بھی آ کر جمع کی ہے اور اسے ہمیشہ سر بلند رکھا ہے اور آج ’سنگم‘ کی صحافتی تاریخ صرف صحافتی کارناموں تک محدود نہیں ہے بلکہ اس دور میں ملت کے ترجمان اور ایک مضبوط تحریک کے علمبردار اور روح رواں کی حیثیت اسے حاصل ہے۔ انہیں لفظوں کے ساتھ ’سنگم‘ کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور انتہائی خلوص کے ساتھ خیر سگالی کے جذبات پیش کرتے ہیں اور دعا ہے کہ ’سنگم‘ تابندہ اور پائندہ رہے۔

بیتاب صدیقی: ادبی خدمات

بیتاب صدیقی عمل کے ساتھ قلم کے بھی دھنی تھے۔ انہوں نے اگر چہ اربابِ اقتدار تک اپنے تحریکی مشن کی ترسیل وابلاغ کے لیے شروع سے صحافت کو ادب پر ترجیح دی۔ اس کے باوجود ان کی ادبی خدمات کا دائرہ انتہائی وسیع، وقیع اور متعدد پہلوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہے۔ اس اعتبار سے ان کا شمار بہار کے صف اوّل کے ادیبوں میں کیا جانا چاہیے۔

ابتدائے عمر سے بیتاب صدیقی کی مختلف مدرسوں میں تعلیم، مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ میں داخلے کے بعد وہاں کا علمی وادبی ماحول، تقریباً 70 سال پہلے کے عظیم آباد کی ادبی سرگرمیاں، پھر ان کے حلقۂ احباب ومعاصرین میں ایسے لوگوں کی اکثریت تھی جن کا شمار اپنے عہد کے ممتاز ادبا، شعرا اور صحافیوں میں ہوتا تھا اور جن کی ادبی شہرت غیر منقسم ہندوستان میں تسلیم شدہ تھی۔ چنانچہ ان سازگار علمی وادبی فضاؤں نے ان کے ذہن کے دریچوں کو کھولنے اور ان کی تحریر وتصنیف کو جلا بخشنے میں دوآتشہ کا کام کیا۔ بیتاب صدیقی کی ادبی زندگی کا ایک قابل ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ جس طرح انہوں نے اردو کی میراث کو بچانے اور اردو تحریک کی مختلف مہمات کو سر کرنے کے لیے اپنی شاعری کا گلا گھونٹ دیا۔ اسی طرح انشاپردازی کے تمام جوہر ہوتے ہوئے انہوں نے ایسا اسلوب اختیار کیا جو ادبی کیف وکم کے ساتھ سہل، سادہ، رواں دواں اور عام فہم تھا، کیوں کہ ان کے موضوعات زیادہ تر جذبہ حب الوطنی اور حریت کے فکر وعمل کا فروغ، ہندوستان کی آزادی میں مسلمانوں کے کردار کی بازیافت، قومی یکجہتی اور خیر سگالی کا ارتقا نیز مسلمانوں میں حقیقی سیاسی شعور اور قومی وملی ادراک پیدا کرنا تھا۔ اس نوع کی ان کی تحریروں میں سراج الدولہ، جنگ آزادی میں مدرسہ اسلامیہ کے اساتذہ وطلبہ کا کردار، ہندو مہا سبھا اور مسلمان، جشن جمہوریہ وغیرہ جیسے چشم کشا اداریے ومضامین کے علاوہ 'معمار قوم شاہ محمد زبیر' جیسی ضخیم تصنیف ادبی دنیا میں ایک بیش قیمت اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

یوں تو اردو میں انقلابی اور تحریکی شاعری کی کسی زمانے میں کمی نہیں رہی ہے، لیکن پورے ہندوستان میں بالعموم اور ریاست بہار میں بالخصوص اردو اور اردو تحریک کے حوالوں سے نثر میں جن اصحاب قلم نے سب سے زیادہ خامہ فرسائی کی اور اس موضوع پر انتہائی وسیع سرمایہ چھوڑا ان میں غلام سرور، عبدالمغنی اور تقی رحیم کے علاوہ بیتاب صدیقی کا نام سرفہرست ہے۔ چنانچہ بیتاب صدیقی کی اس نوع کی تحریروں میں 'ہندوستان کی جنگ آزادی میں اردو کا حصہ'، 'اردو جمہوریت کی کسوٹی'، 'بہار میں یوم اردو'، 'اردو کے فروغ میں سرکاری دیانت داری کا دعویٰ' وغیرہ تاریخی، سیاسی وادبی نقطہ نظر سے منفرد ہیں۔ بیتاب صدیقی کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ایک اور پہلو ہمارے سامنے آتا ہے اور وہ ہے اردو میں تحریکی لٹریچر کا تصور میرے خیال میں یہ تصور 1951ء کے بعد کی پیداوار ہے جب کہ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کا قیام معرض وجود میں آچکا تھا۔ مابعد آزادی، ہندوستان میں اردو کی آئینی ولسانی حیثیت، اردو کا بنیادی اور حقیقی مسئلہ، اردو کو ثانوی زبان کا رتبہ دینے کا مطالبہ، اردو رسم الخط کے تحفظ کا معاملہ، اردو کی ہمہ جہت ترقی وترویج کی جدوجہد، درس وتدریس کا معقول نظم، سرکاری ونجی اسکولوں اور مدرسوں میں اردو کی تعلیم اور نصاب کی فراہمی، اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تقرری اور اردو یونٹ پر ہی ان کی پوسٹنگ، اردو گرلس اسکول کا قیام واستحکام، سہ لسانی فارمولے پر عمل درآمد، مقابلہ جاتی امتحانات اور سول سروسیز میں اردو کی ایک مضمون کی حیثیت سے شمولیت، ہائی اسکولوں کے امتحانات کے جواب اردو زبان میں لکھنے کی سہولت، یونیورسٹیوں میں علاحدہ اردو شعبوں کا قیام، بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ اور ثانوی زبان کے سرکاری فیصلے کے بعد اس کی راہ میں رکاوٹیں اور نوٹیفکیشن کی خامیاں جیسے موضوعات پر ریاستی انجمن ترقی اردو کے دیگر قائدین کے علاوہ بیتاب صدیقی نے بھی اچھا خاصا تحریری سرمایہ چھوڑا ہے۔ جس میں میمورنڈم، جلسوں کی روئداد، کانفرنسوں کی رپورٹ نیز انجمن کی کارکردگیوں پر مشتمل مضامین، کتاب، کتابچہ اور فولڈر شامل ہے۔ اس سلسلے میں 'بہار میں اردو کے پانچ سال'، 'بہار میں اردو کے چھ سال'، 'بہار میں اردو کے پچیس سال'، 'بہار میں اردو کے پچاس سال'، 'بہار میں یوم اردو'، 'اردو کی حمایت'، 'اردو دوستوں سے دو باتیں'، 'سکریٹری رپورٹ' (بہار ریاستی اردو کانفرنس مظفرپور، 26, 25، 27 اپریل 1975ء) کے علاوہ ریاست کے مختلف ضلعوں میں وقفہ وقفہ سے ہونے والے کنونشن پر مشتمل روئداد کی اشاعت وہ بیش قیمت تحریکی نیز ادبی شہ پارے ہیں جن کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزادی کے بعد انتہائی نامساعد حالات میں اردو کی میراث کو بچانے کے لیے ہمارے اسلاف کے ساتھ عوام نے

کس قدر قربانیاں پیش کی ہیں۔اگر چہ ایسے سرمایہ ادب کی زبان کو یقینی طور پر دفتری اور سرکاری ہونا چاہیے تھا مگر ان کا اسلوب انتہائی دلنشیں اور مؤثر ہے جسے پڑھ کر ادبی لطف اور طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔

بیتاب صدیقی پیشہ ورانہ طور پر ایک معلم تھے۔وہ بہار میں اردو اور فارسی نصاب کے معیار کی بہتری کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے، اردو و فارسی کی درسی کتابوں کی بروقت دستیابی، نیز دستور کے شیڈولڈ 8 کے مطابق دیگر علاقائی زبانوں میں کتابوں کی تصنیف، تالیف اور ترجمے سے انہیں گہری دلچسپی تھی، انہوں نے خود متعدد نصاب تیار کیے اور بے شمار کتابوں کے تراجم کیے، بعض کے لیے ٹکسٹ بک کارپوریشن اور مختلف زبانوں کے دیگر مصنفین ومترجمین کے رابطے میں رہے۔انہوں نے 'اردو کمپوزیشن' کے نام سے ایک انتہائی جامع اور مفید کتاب بھی مرتب کی تھی۔جس کی متعدد اشاعتیں ان کی زندگی میں ہوئیں مگر اب وہ دستیاب نہیں ہے۔

بچوں کے لیے درسیات:

یوں تو پوری اردو تحریک کا مرکز ومنبع اردو کا تدریسی ونصابی معاملہ بطور خاص تھا۔لیکن بچوں میں اردو کی نصابی و درسی کتابوں سے ذوق وشوق پیدا کرنے اور امتحانات میں ان کے ممکنہ سوالات کے جوابات عام فہم انداز میں ذہن نشیں کرنے سے متعلق 70 سال قبل بیتاب صدیقی کی جو فکر مندی تھی وہ لائق صد آفریں اور داد وتحسین کی مستحق ہے۔اس کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ حال میں بیتاب صدیقی کی ایک بوسیدہ کاپی ان کے فرزند خورشید انور (علیگ) کے توسط سے دستیاب ہوئی ہے۔جس پر ان کے ہاتھوں سے (URDU) MIL-2 -1953-54 درج ہے۔اس میں بچوں کے اردو نصاب سے متعلق اردو قواعد، متعدد معروف نظموں کے خلاصے، غزلوں کی تشریحات، خطوط نویسی کے نمونے وغیرہ ہیں۔اس کے علاوہ غالب، اقبال، اکبر، انیس وغیرہ کے کلام پر عام فہم تنقیدی وتبصراتی جائزے ہیں۔نیز سرسید کے مختلف مضامین کے علاوہ پریم چند اور فضل حق قریشی کے کچھ افسانوں کا بڑے دلنشیں اور سادہ سہل انداز میں خلاصہ ہے۔یہ تمام تحریریں ابتدائی درجات کے بچوں کے ذہنی سطح کے پیش نظر تیار گئی ہیں یہاں دو نمونے درج ہیں۔جن میں ایک کا عنوان 'ادب سے ہی انسان انسان ہے' اور دوسرا اقبال کی 'بانگ درا' ہے۔ چنانچہ پہلے 'ادب سے ہی انسان انسان ہے' ملاحظہ ہو:

''ادب کے معنی تعظیم وشائستگی کے ہیں، جو انسان کو دیگر حیوانوں سے ممتاز کرتا ہے۔ انسان کو مہذب جانور کہا جاتا ہے اس لیے انسان نے اپنی زندگی بسر کرنے اور زندگی کا صحیح

لطف حاصل کرنے کے لیے چند ضابطے اور قوانین بنائے ہیں۔اسے سماجی اور معاشرتی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔مہذب دنیا میں ان اصولوں پر عمل درآمد ہوتا ہے اور وہ اصول یہ ہے کہ چھوٹا بڑے کی تعظیم کرے اور بڑا چھوٹے پر شفقت کی نظر رکھے۔شاگرد استاد کا احترام کرے۔ بچے والدین کی اطاعت اور احترام ملحوظ رکھیں۔اس طرح ایک منظم معاشرہ کام کرتا رہے۔

ایک صحت مند معاشرہ کے لیے ادب کی بہت زیادہ ضرورت ہے کیوں کہ جب تک لوگوں میں ادب وتعظیم کا جذبہ پیدا نہ ہوگا وہ ایک بہتر شہری نہیں بن سکتے اور یہ جذبہ کمسنی میں ہی بچہ میں پیدا کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ انسان عادتوں کا مجموعہ ہے۔آئندہ زندگی ابتدائی عادتوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔لہٰذا جذبہ تعظیم وادب سے اچھی سوسائٹی میں شرکت کا موقع ملے گا۔کیوں کہ انسان کا ایک فرض سوسائٹی کا انتخاب بھی ہے۔بروں کی صحبت سے برا اور اچھوں کی صحبت سے اچھا نمونہ ملتا ہے۔لہٰذا اس کی ضرورت ہے کہ بچوں میں جذبہ تعظیم کی پرورش کی جائے۔

ادب سیکھنے سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے کنبہ اور خاندان کے ایک اچھے رکن کی حیثیت سے خود قابل عزت سمجھا جائے گا۔اور اس طرح بہت سی بری صحبتوں میں شرکت کا موقع ہی نہ ملے گا۔اگر باادب شخص تعلیم سے بے بہرہ ہے پھر بھی سوسائٹی میں جگہ مل سکتی ہے کیوں کہ لوگ بے ادبوں کو پاس بٹھانے سے پرہیز کرتے ہیں خواہ وہ پڑھا ہو یا اَن پڑھ ہو اور جب انسان اچھی صحبت میں جگہ حاصل کر لیتا ہے تو اس کے فوائد سے بھی لازمی طور پر وہ بہرہ ور ہوتا ہے۔دراصل ایک بے ادب شخص سوسائٹی کی بخشی ہوئی نعمتوں سے محروم رہتا ہے۔بقول کسے ع

یہ سچ بات ہے بے ادب بے نصیب

لہٰذا ہمیں چاہیے کہ نہ صرف اپنے بچوں میں ادب کا جذبہ پیدا کریں اور اسے ادب سکھلائیں بلکہ سوسائٹی کے ہر فرد کو باادب بنادیں تا کہ ہماری سوسائٹی دوسروں کے لیے نمونہ بن سکے۔مذاہب نے بھی ادب وتعظیم کے جذبے پر زور دیا ہے اور اسلام میں خصوصیت کے ساتھ ادب کی بڑی اہمیت ہے۔چنانچہ ہمارے سامنے صحابہ کرامؓ کی مثال ہے۔ہمارے

ملک کے سب سے بڑے رہنما مہاتما گاندھی ہمیشہ بچوں اور بڑوں کو باادب بننے کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بڑے بڑے لوگوں کو پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی کہ ان کی ابتدائی دور ہی سے انہوں نے تربیت بھی دی۔''

اقبال کی شاعری:

''مولوی عبدالحق کا یہ مضمون (بانگ درا کے حوالے سے) تنقیدی ہے۔ جس میں اقبال کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے ناقد نے ان کی کتاب بانگ درا پر ناقدانہ تبصرہ کیا ہے۔ عبدالحق صاحب نے 'بانگ درا' کو دو حصوں یا دو دور پر تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور 'ہمالہ' سے شروع ہو کر 'نیا شوالہ' پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور میں اقبال نے حب الوطنی کے جذبات اور قومی احساسات کا اظہار والہانہ انداز میں کیا ہے۔ نظم 'ہمالہ' ان کی پہلی نظم ہے۔ جس میں تخیل، تشبیہات، بندش اور خیال شاعر کے مستقبل کی غمازی کر رہے ہیں۔ اس نظم کی ابتداء میں حب وطن کی بو آتی ہے اور جیسے جیسے آگے بڑھیے اس کی مہک بڑھتی جاتی ہے۔ چند صفحوں کے بعد 'صدائے دل' کے عنوان سے ایک نظم ہے جس میں شاعر دردِ دل سے چیخ اٹھتا ہے اور ملک کی بد نصیبی پر آنسو بہاتا ہے۔ چند صفحات الٹنے کے بعد اقبال کی مشہور نظم 'ترانہ ہندی' نظر آتی ہے۔ اسے ملک بھر میں بیحد مقبولیت حاصل ہوئی اور آج بھی قومی گیت کی حیثیت سے ہر ہندوستانی کی زبان پر جاری ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ حب وطن میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس کے بعد ہی وطن کی محبت کا ایک دوسرا راگ 'ہندوستانی بچوں کا قومی گیت' ہے۔ اس گیت کے خاتمہ پر نظم 'نیا شوالہ' ہے۔ یہ شاعر کے انتہائے کمال کا نمونہ بلکہ ایک شاہکار ہے۔ ہر شعر اور ہر لفظ میں محبت کی آگ بھری ہوئی ہے جسے آبِ زر سے لکھا جانا چاہیے۔

دوسرے دور کا آغاز اس مجموعے کے دوسرے حصے سے ہوتا ہے جسے عبدالحق صاحب حب ملت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس کی ابتدا اقبال مرحوم کے دورانِ قیام لندن 1905ء سے ہوتی ہے۔ اس دور میں شاعر وطنیت سے بلند مغربی سیاست سے علاحدگی پر مبنی خیالات ظاہر کرتا ہے۔ وہ مغربی تہذیب و آئین سے الگ رہنے کا مشورہ دیتا ہے اور مسلمانوں کو ملی اتحاد کا سبق دیتا ہے۔ شاعر مسلمانوں میں قرون اولیٰ کے مسلمانوں کا کردار پیدا کرنا چاہتا ہے اور اسلام کی پاک تعلیم کے ذریعہ ایشیا کی رہبری اور دنیا کی امامت کا درس

دیتا ہے کیوں کہ اسی میں دنیا کی نجات ہے۔ اقبال کے 'پیام ملت' میں 1905ء کے بعد زیادہ زور اور قوت پیدا ہوتی ہے۔ اس دور کے کلام میں بلندی، خلوص اور جوش ہے۔ جس کا مقصد ملک گیری نہیں بلکہ سوتوں کو جگانے کے لیے روحانی پیام ہے۔ اس کا مقصد اتحادِ ملی کے ذریعہ اسلامی اصول و آئین کی اشاعت ہے۔ لیکن مسلمانوں کو 'ترانہ ہندی' کو بھی بالکل نہیں بھلا دینا چاہیے۔ اقبال کی شاعرانہ عظمت معلوم کرنے کے لیے 'شمع و شاعر'، 'خضر راہ' اور 'طلوعِ اسلام' پڑھنا چاہیے۔ اقبال کی شاعری میں تخیل کی بلندی بتاتی ہے کہ ان کے کلام پر مرزا غالب کا کافی اثر ہے۔ اقبال کے کلام کا موازنہ ٹیگور کی شاعری سے کیا جاتا ہے کیوں کہ دونوں کے یہاں محبت عالمگیر ہے، لیکن جو آگ اقبال میں ہے وہ ٹیگور میں نہیں، ٹیگور کیف و جذب میں آپے سے باہر نہیں ہوتا کیوں کہ اس کے یہاں نازک موقع پر بھی عقل کا سایہ موجود ہے۔ مگر اقبال جذبات کے تلاطم کے آگے عقل بیچاری کو درماندہ چھوڑ دیتا ہے، کیوں کہ اس کے یہاں صرف وارفتگی اور شیفتگی ہے۔''

بیتاب صدیقی کی ادبی تصورات کے حوالوں سے یہاں بطور نمونہ ان کے چند مضامین و مقالات کے مکمل متن درج کیے جاتے ہیں جو ان کی ادبی قدر و قیمت کے تعین میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ان کی تصنیف 'معمارِ قوم شاہ محمد زبیر' کی تلخیص بھی ملاحظہ کی جا سکتی ہے، جو اس موضوع پر اردو میں اوّلین تصنیف ہے۔

ہندوستان کی جنگ آزادی میں اردو کا حصہ

''اردو زبان نے اپنی ابتدائے آفرینش سے ملک و قوم کی تعمیر و ترقی میں سرگرم حصہ لیا ہے۔ ملک کی تہذیب و تمدن کے سنوارنے میں اس نے خون پسینہ ایک کیا ہے۔ اس ملک میں اتحاد و یگانگی پیدا کرنے میں اردو کا نمایاں کردار رہا ہے۔ مگر سب سے زیادہ اہم پارٹ اس نے ملک کی آزادی میں ادا کی۔ دراصل ایک فلاحی ریاست کی طرح اردو بھی ایک فلاحی زبان و ادب ہے۔ جو صرف خیر مشترک کی حامل ہے۔ اردو جس ماحول میں پروان چڑھی وہ خالص ہندوستانی اور عوامی تھا۔ گرچہ عوام اور جمہور کا معنی اس وقت ہندوستان میں بہت زیادہ اجاگر نہیں ہوا تھا۔

بہرکیف! اردو نے آنکھ کھولتے ہی اپنے ماحول کے زیر اثر غیر ملکی منفی اثرات اور دباؤ کو محسوس کیا اور آہستہ آہستہ اسے یہ احساس ہونے لگا کہ ہندوستان کے اردگرد سازشوں کا جال بُنا جا رہا ہے اور ملک کی آزادی اور مادرِ وطن کی عزت و ناموس کو بڑا خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ اقتصادی اور معاشی طور پر ہندوستان کو مفلوج کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ ہندوستان کی قدیم صنعت وحرفت کا گلا گھونٹا جانے والا ہے۔ یہ جنت نشان ہندوستان اب ماضی کی داستان بننے کو ہے۔ اس صورتحال کو بھانپتے ہی اور اس ارادے کو محسوس کرتے ہی غیر ملکی اثر ورسوخ اور غیر ملکی اقتدار کے خلاف اعصابی جنگ شروع کر دی اور رائے عامہ کو بیدار کرنے لگی اور فیصلہ کن آزادی کے لیے فضا ہموار کرنا شروع کر دی۔ اس کا اندازہ قدیم اردو شعرا کی نظموں، اشعار اور شہر آشوب وغیرہ سے ہوتا ہے۔ انہوں نے جو کچھ کہا ہے زیادہ تر اشاروں میں کہا ہے۔ کیوں کہ اس زمانے میں شعرا کو آج کی سی آزادی فکر وخیال اور آزادی بیان حاصل نہ تھی۔ پھر بھی ان کے کلام میں اس زمانہ کی معاشی واقتصادی بے چینی اور سیاسی افراتفری کی جھلک نمایاں طور پر پائی جاتی ہے۔ بعض شعرا نے حکومت پر سخت تنقیدیں بھی کی ہیں۔ حاتم، سودا، میر، قائم، جعفر، علی حسرت، کمال الدین کمال کے شہر آشوب کافی اہم ہیں۔ شاہ مبارک آبرو نے امیروں کو صاف لفظوں میں للکارا ہے۔ اشاروں، کنایوں کے اشعار میں راجا رام نارائن موزوں کا یہ شعر بہت نمایاں اور قدیم ہے جو انہوں نے سراج الدولہ کی وفات پر کہا تھا:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

سودا نے اپنے شہر آشوب میں ملک اور رعایا کی ابتری کا واضح طور پر ذکر کیا ہے۔ سودا کی ایک قطعہ بند غزل ہے جس میں انہوں نے ایک فقیر کی زبان سے آئین حکومت بتا کر حکومت پر کڑی تنقید کی ہے۔ میر کے کئی خمسے ایسے ہیں جن سے اس زمانے کی اقتصادی بے چینی کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کا یہ خمسہ ملاحظہ کیا جائے:

عمدے جو ہیں دنوں کو بھرتے ہیں
سو بھی اسباب گروی دھرتے ہیں

ہیں سپاہی سو بھوکے مرتے ہیں
لوہو پی پی کے زیست کرتے ہیں
ایک تلوار بیچے ہے اک ڈھال

میر کے دوسرے منفرد شعروں سے بھی اقتصادی اور معاشی بے چینی ٹپکتی ہے:

نہ مل میر اب کے امیروں سے تو
ہوئے ہیں فقیر ان کی دولت سے ہم
کیا کہیے ان کے عہد میں جتنے امیر تھے
ٹکڑے پے جان دیتے تھے سارے فقیر تھے
صناع ہیں سب خوار، ازاں جملہ ہوں میں بھی
ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے
ہند میں ہوگئے برباد ہزاروں اس سال
شامت بخت یہ اے بارِ خدا کس کی ہے
دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تخت وتاج کا

عبدالحئی تاباں کے اشعار سے بھی اس دور کی بے چینی اور ابتری کا اندازہ لگتا ہے اور قائم نے اپنے شہر آشوب میں شاہ عالم کو صورتحال کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے سخت لفظوں میں تنقید کی ہے جو اس دور کی معمولی بات نہ تھی:

کیا یہ شاہ، ظلم پر اس کی نگاہ ہے
ہاتھوں سے اس کے ایک جہاں دادخواہ ہے
لچا اک آپ، ساتھ لٹیری سپاہ ہے
ناموس خلق سائے میں اس کے تباہ ہے
شیطان کا یہ ظل ہے نہ ظل اللہ ہے

شاہ کمال الدین کمال نے اپنے شہر آشوب میں ملک کی تباہی کا نقشہ کھینچتے ہوئے انگریزوں سے بیزاری کا بھی اظہار کیا ہے:

وہی یہ شہر ہے اور ہے وہی یہ ہندوستاں
کہ جس کو ایک جناں جانتے ہیں سب انساں
فرنگیوں کی سو کثرت سے ہوئے سب ویراں
نظر پڑے ہے پس اب صورت فرنگستاں
نہیں سوار رہے یاں سوائے ترک سوار
اسی سے سمجھو رہا سلطنت میں کیا تیار
ہو جب کہ محل سراؤں میں گوروں کا پہرا
نہ شاہ ہے نہ وزیر اب فرنگی ہیں مختار

جرأت نے جنگ آزادی کے سپاہی اور آصف الدولہ کے تخت کے جائز حقدار وزیر اعلیٰ خان کے خلاف انگریزوں سے سعادت علی خان کی سازش سے متاثر ہو کر کہا تھا:

سمجھیں یہ اسیران اہل توقیر
انگریزوں کے ہاتھ سے قفس میں ہیں اسیر
جو کچھ وہ پڑھائیں وہی منہ سے بولیں
بنگالے کی مینا ہیں یہ یورپ کے امیر

مندرجہ اشعار سے بھی عام جذبات اور انگریز دشمنی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کی دولت وحشمت جو کچھ بھی تھی کافر فرنگیوں نے سب کو نیست و نابود کرنے کے تئیں تدبیریں سوچیں:

لعنت ہے ایسے سکے اور زر چلانے میں
سر کمپنی کا کٹ کے بکا سولہ آنے میں

اردو صحافت کے جنم لیتے ہی عوام نے حب الوطنی اور حریت کا جذبہ اٹھانا شروع کیا۔ اردو کا پہلا اخبار 'جام جہاں نما' جو 1823ء میں نکلا۔ اپنے کالموں میں برابر انگریزی حکومت کے خلاف بیداری کا جذبہ ابھارنے میں مصروف رہا۔ پہلی جنگ آزادی کا معرکہ 1857ء تک تقریباً اردو کے پینتالیس اخبار نکلے اور سب کے سب بہت بے باکی کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کرتے رہے۔ غیر ملکی اقتدار کے خلاف جس قدر وہ جذبہ پیدا کر سکتے

تھے انہوں نے پیدا کیا۔ بلکہ 1857ء میں ہندوستانیوں نے انگریزی اقتدار کے خلاف جو جنگ کی تھی انگریز کارکنان نے اس کی زیادہ تر ذمہ داری ان اخبارات پر عائد کی ہے۔

'صادق الاخبار' دہلی کے مہتمم جمال الدین کو انگریزی اقتدار کی بدخواہی کے الزام میں تین سال قید کی سزا ہوئی۔ 'دہلی اردو اخبار' کے مالک اور ایڈیٹر محمد حسین آزاد کے والد محمد باقر کو دہلی پر دوبارہ انگریزی تسلط کے بعد سولی پر چڑھا دیا گیا۔ 'دہلی اردو اخبار' بے لاگ تبصرہ کیا کرتا تھا۔ برائی کے خلاف آواز اٹھانا وہ اپنا فرض سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک امیر وغریب، ہندو و مسلم، سکھ عیسائی سب برابر تھے۔ انگریزوں کے ظلم وستم کی خبریں اس اخبار میں شائع ہوتیں اور انگریزوں کے خلاف سازشوں کی خبر بھی فخریہ شائع کی جاتی۔

1857ء میں علمائے کرام نے انگریزوں کے خلاف جو جہاد کا فتویٰ دیا تھا وہ 'اخبار الظفر' دہلی میں شائع ہوتا تھا۔ اس پر مفتی صدر الدین آزردہ کے بھی دستخط تھے۔ تحریک آزادی کے لیے زمین ہموار کرنے اور ہندوستانیوں میں بیداری کی لہر دوڑانے میں اردو ادیبوں، شاعروں اور عالموں میں امام بخش صہبائی، مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی صدر الدین آزردہ، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ وغیرہ کا اس دور میں نمایاں حصہ ہے۔ اردو کے یہ وہ ادیب وشاعر ہیں کہ جن کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ پہلی ہی تحریک آزادی میں دار ورسن کی آزمائش سے گزرے۔ یہ اردو زبان وادب کی کرشمہ سازی تھی کہ گل وبلبل کے قصیدہ خواں دار ورسن سے کھیلنے لگے۔ یہ فخر اردو زبان وادب کو ہی حاصل ہے کہ اس کے پرستاروں نے آزادی کی راہ میں اتنی زبردست قربانیاں دی ہیں کہ کسی زبان وادب کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

1857ء کے انقلاب کے دوران اور اس کے بعد انگریزوں نے ہندوستانیوں کے جذبہ حریت کو فنا کر دینا چاہا اور ہر ممکن طور پہ انہوں نے کوشش کی جس میں انہیں بڑی حد تک کامیابی ہوئی، لیکن ہندوستانیوں کے دلوں میں جذبات کا طوفان اٹھتا رہتا تھا۔ مگر متحدہ طور پر کسی تحریک کی بالکل صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ کیوں کہ وہ بری طرح کچل دیئے گئے تھے۔ اس عہد کے اردو ادب کی سطح پر تو نہیں لیکن ان کی تہہ میں تموج پائے جاتے ہیں۔ اور ان کی زندگی کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حریت کی تحریک نے اپنا رخ یا اپنا محاذ بدل

دیا اور ہندوستانیوں میں زندگی پیدا کرنے کے لیے متعدد سوسائٹیاں اور انجمنیں قائم ہوئیں۔ جس میں سماجی اور تہذیبی اصلاح پر زور دیا گیا، تاکہ آگے چل کر ہندوستانی کسی سیاسی جدوجہد کے لائق بن سکیں۔ شاطران فرنگ نے بھی اردو زبان وادب کے اس مشترکہ تہذیبی رجحان کو بھانپ لیا اور اردو کی قومی اور نمائندہ حیثیت پر ضرب کاری لگانے کی ٹھان لی۔ چنانچہ فورٹ ولیم کالج میں 1800ء میں سازش کی ٹیم بنائی اور نہایت ہی چالاکی کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں میں اختلافات کی خلیج وسیع کر کے ان کی متحدہ قومیت کی بنیاد کو متزلزل کرنے کے لیے فورٹ ولیم کالج کی تحریک کے ذریعہ اردو ہندی کے مابین نزاع ہو، ہوا دی گئی۔ چنانچہ ڈاکٹر جان گلکرائسٹ نے ہندی اردو کا قضیہ کھڑا کیا تھا جو 1857ء کے انقلاب کے وقت بارآور نہ ہوا تھا۔ لیکن بالآخر اس نے قومی اتحاد کا شیرازہ بکھیر دیا اور اب اردو ہندی کے جھگڑے نے اس طرح سر اٹھایا کہ ملک میں اختلاف کی خلیج کو بڑھانے میں کامیابی حاصل کرلی۔ اور اتفاق واتحاد کی ساری امیدیں ختم ہوگئیں، لیکن اردو نے اختلافات کے سامنے سپر نہیں ڈالا بلکہ اسی لگن کے ساتھ جنگ آزادی کی تحریکات کو جنم دیتی رہی اور پروان چڑھاتی رہی۔ سرسید نے 'اسباب بغاوت ہند' لکھ کر آزادی کے فداکاروں کے خلاف جبروتشدد کی جو تحریک چل رہی تھی اسے مدھم کردیا۔

انیسویں صدی کے آخر میں کانگریس کی بنیاد پڑی۔ جس کے لیے فضا ہموار کرنے میں اس عہد کے اردو اخبارات کا زبردست ہاتھ ہے۔ 'الپنچ'، پٹنہ، 'اودھ پنچ' لکھنؤ، 'رفیق ہند' لاہور وغیرہ کے مطالعہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس دور میں بھی عوام میں بیداری اور زندگی پیدا کرنے میں اردو اخباروں نے نمایاں حصہ لیا اور انگریزوں نے سماجی، تہذیبی اور قانونی حیثیت سے جو اپنے لیے برتر حیثیت قائم کر رکھی تھی اس کے خلاف اردو اخبارات سخت تنقیدیں کیا کرتے تھے۔ 'اخبار عام' لاہور کے شمارے نے ہندوستانیوں کو یہ پیغام دیا:

اے ساکنان خطہ ہندوستاں بڑھو
آگے نکل گئے ہیں بہت کارواں بڑھو
نام ایشیا کا سارے جہاں میں بلند ہو
کاندھے پہ رکھ کے قوم کا اونچا نشاں بڑھو

'اودھ پنچ' نے مزاحیہ کالموں اور کارٹون کے ذریعہ انگریزی حکومت اور اس کی سیاست نیز تہذیب وتمدن سے تیر برسانا شروع کیا۔ 'اودھ پنچ' کے مضمون نگاروں اور شاعروں میں سید محمد آزاد، چکبست، اکبرالہ آبادی وغیرہ حضرات تھے جنہیں اپنی غلامی کی ذلت کا احساس تھا اور بیرونی اقتدار کے وہ مخالف تھے۔ چنانچہ انہوں نے بھی اردو زبان وادب کو حب الوطنی کے جواہر پاروں سے مالا مال کیا۔

بیسویں صدی شروع ہوتے ہی ایشیا میں ہلچل مچ گئی، ہندوستان پر بھی حالات کا اثر پڑا۔ اردو ادب نے بھی ان اثرات کو قبول کیا۔ چنانچہ اس دور میں وطن کے لیے جتنے نغمے گائے گئے اس کی مثال کسی دور میں نہیں ملتی ہے۔ اقبال، حسرت موہانی، ظفر علی خاں، حالی، شبلی، پریم چند وغیرہ ہر ایک نے اپنے مضامین اور ولولہ انگیز جذبوں کے ذریعہ بیداری کی لہریں ملک کے رگ وپے میں دوڑانے کی کوشش کی۔ اقبال کی نظم 'ہمالہ'، 'نیا شوالہ'، 'تصویر درد'، 'ترانہ ہندی' وغیرہ چکبست کی نظم 'خاک وطن'، سرور جہان آبادی کی نظم 'پھولوں کا کنج'، آنند نارائن ملا کی 'زمین وطن' وغیرہ نظمیں وطن دوستی کے جذبات سے معمور ہیں۔ شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی نے بھی اپنی نظموں کی وجہ سے کافی مقبولیت حاصل کی۔ حامد اللہ افسر، ساغر، مجاز وغیرہ نے بھی وطنی نظمیں لکھی ہیں۔ اسی زمانے میں سودیسی تحریک شروع ہوئی۔ اردو شاعر اور ادیب اس سے بھی متاثر ہوئے اور اکبر نے اس تحریک کا خیر مقدم کیا اور کہا:

تحریک سودیسی پہ مجھے وجد ہے اکبر
کیا خوب یہ نغمہ ہے چھڑا دیس کی دھن میں

اقبال کی دوربیں اور نکتہ رس نگاہوں نے ہماری غلامی اور افلاس کا اصل سبب صنعتی میدان میں ہماری کم مائیگی کو قرار دے کر چند مضامین کے ذریعہ غیر ملکی تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لیے ترقی پر زور دیا۔ اس پروگرام کو ملک نے اپنایا۔ اس دور میں کلکتہ سے 'الہلال' کے ذریعہ مولانا آزاد نے جنگ آزادی کا بگل بجایا۔ جس نے ملک بھر میں سیاسی بیداری کی روح پھونک دی۔ مولانا محمد علی جوہر جو انگریز دشمنی اور آزادی وطن، وطن کی محبت اور اپنے جوش کے ساتھ جرأت اور صداقت کے لیے مشہور تھے اسی دور میں 'ہمدرد' اخبار

جاری کیا۔اسی زمانے میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے لکھنؤ سے 'ہمدم' نکالا۔'مسلم گزٹ' شبلی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھا۔ان اخبارات نے اس دور میں آزادی کی جدوجہد کی کامیاب قیادت کی اور 'الہلال' اور 'ہمدرد' تو گویا آزادی کے متوالے مضمون نگاروں اور انشا پردازوں کا ایک حلقہ تھا یا شمع حریت کے پروانوں کے لیے تربیت گاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران اردو نے جنگ آزادی کی تحریک میں رہنمائی کی اور اس وقت کچھ حالات ایسے پیدا ہوگئے تھے کہ اردو کے سرپرستوں کے ہاتھ میں آزادی کی تمام تحریکات کی باگ ڈور تھی۔ چنانچہ غیر ملکی حکومت نے پھر ایک بار اردو کے خلاف ملک میں فرقہ وارانہ فساد کو لاکر کھڑا کر دیا اور فرقہ وارانہ رجحان کو خوب اچھی طرح مشتعل کیا۔جس سے غیر ملکی حکومت کو کامیابی تو ہوئی مگر اردو نے بھی آخری دم تک انگریزی اقتدار کے خلاف جنگ کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ چنانچہ 1936ء سے 1947ء تک اگرچہ ایسی تحریک چلی جس کا مقصد اردو تحریک کو جنگ آزادی کی راہ سے ہٹانا تھا لیکن انہیں سخت ناکامی ہوئی اور اس تحریک میں کوئی بڑا ادیب شامل نہ ہوا اور اس کٹھن دور کے اردو ادب کا مطالعہ کیا جائے تو صاف پتا چلتا ہے کہ اردو ادب نے رجعت پسندانہ تحریکات کا اثر بالکل نہیں قبول کیا بلکہ نمایاں طور پر وطنی نقطہ نظر کی اس میں جھلک موجود ہے اور حب الوطنی کا رنگ غالب ہے۔ بلکہ ہر ترقی پسند نقطہ نظر کی اس نے بزور ہمنوائی کی ہے مگر یہ دوسری بات ہے کہ آزادی کے بعد ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا جا رہا ہے کہ اردو کو جنگ آزادی کی تاریخ سے نکال دیا جائے اور اسے غیر ملکی اقتدار کے دور کی یادگار سمجھا جائے۔حکومت ہند کی وزارت داخلہ نے اپنے حالیہ اعلان کے ذریعہ اس نقطہ نظر کی تصدیق کی ہے لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ عملاً اس کی ریاستی حکومتیں کب تکذیب کرتی ہیں۔

(ہفتہ وار سنگم، پٹنہ۔23 اگست 1958ء)

گیسوئے اردو ابھی...

آزادی سے پہلے ملک کی جو آب وہوا تھی اس کے اثرات کو دیر پا سمجھنے والوں نے آزادی کے بعد اردو کو مریض جاں بلب قرار دیا اور یہ سمجھ لیا کہ بہار میں اردو زبان اب چند دنوں کی مہمان ہے۔مگر تھوڑے ہی عرصہ میں انہیں اپنی رائے بدل کر یہ یقین کرنا پڑا کہ اردو اپنے اندر توانائی رکھتی ہے اور یہ تہذیبی تمدنی قدروں کے ساتھ بڑے سے بڑے طوفان کا مقابلہ کرتے ہوئے پروان چڑھی ہے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ خطرات میں گھری ہوئی تھی۔ پرائے اس سے بدظن، اپنے اس سے مایوس، دشمن خنجر سنبھالے اس پر وار پر وار کر رہے تھے۔ اس کی آبیاری کرنے والے ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا تھے۔اور کچھ ایسے بھی تھے کہ اس کے تحفظ و بقا میں مصروف تھے کہ 1951ء کا تاریخی سال آپہنچا، حالات نے کروٹ بدلے اور مؤخر الذکر طبقہ نے انگڑائی لی۔ایک سال پہلے ملک آزاد جمہوریہ بن چکا تھا، جس کے سیکولر دستور میں اردو کو بھی 14، علاقائی زبانوں کی صف میں جگہ مل چکی تھی۔اس نئی فضا میں اردو کے بہی خواہوں نے پھر اپنی مساعی جمیلہ کو تیز تر کرنا چاہا۔ریاست بہار کے اردو دانوں میں برسوں کے پھیلے ہوئے جمود و تعطل کو دور کرنے کی ایک نئی کوشش کی گئی جو بے حد کامیاب رہی، حلقۂ ادب بہار اور بعض دوسری انجمن پچھلے چند برسوں میں سازگار فضا تیار کر چکی تھیں۔اسی سال بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی بنیاد پڑی جو بہار میں اردو کی تاریخ میں اردو دوستوں کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے اور بے مثال کامیابی ہے، کیوں کہ صدیوں سے جو کام انجام نہ پا سکا تھا اسے انجام دینے کی فرائض اپنے ذمہ لے کر انجمن فوراً ہی حرکت و عمل میں آ گئی۔اس مختصر نشست میں بہار میں اردو کی پانچ سالہ تاریخ جو دراصل بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی تاریخ کہی جا سکتی ہے پیش کرنا ممکن نہیں ہے پھر بھی ایک مضمون میں ایک سرسری جائزہ لینے کی کوشش کروں گا۔سب سے پہلے بہار ریاستی انجمن ترقی اردو نے

سارے صوبے میں شاخیں قائم کیں۔اور اردو کے کاموں کو منظّم و مستحکم بنایا۔

انہیں دنوں پٹنہ یونیورسٹی کے اندر آزاد شعبہ اردو کے قیام کے لیے جدوجہد اس نے شروع کی اور جلد ہی یونیورسٹی کے ممبران اکیڈمک کونسل کی ہمدردی اور تعاون اس نے حاصل کرلیا۔جس کے باعث کامل اتفاق رائے سے یونیورسٹی میں آزاد شعبہ اردو کے لیے جائز مقام حاصل کرنے کے لیے بھی تگ ودو کی اور اسی جدوجہد کے نتیجہ میں ان اردو طلبا کے لیے اردو لازمی مضمون کی حیثیت سے قائم رہی جن کی مادری زبان اردو ہے۔

انگریزی دور حکومت میں اردو کو علاقائی زبان کی آئینی حیثیت دلوانے کی کوئی کوشش نہ ہوئی تھی یا شاید اس کی ضرورت نہ سمجھی گئی۔جس کی وجہ سے اردو کی آئینی حیثیت سخت خطرے میں تھی۔ اگر چہ یونین ہند کے دستور میں اسے علاقائی زبانوں کی فہرست میں شامل کرلیا گیا تھا۔

اراکین بہار ریاستی انجمن ترقی اردو نے اسے محسوس کیا۔انجمن نے اپنے تاسیس ہی کے روز سے یہ پروگرام بنالیا کہ بہار میں اردو کو علاقائی زبان کی آئینی حیثیت دلانے کے لیے پرامن دستوری جدوجہد وہ جلد شروع کرے گی۔ چنانچہ 1952ء میں انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں بے حد دقتوں اور رکاوٹوں کے باوجود دستخطی مہم شروع کی جو بہت ہی نازک اور ذمہ داری کا کام تھا۔مگر بحمداللہ کہ انجمن نے کسی فرقہ واریت اور تنگ نظری کو راہ دیئے بغیر ریاست بہار میں ہندو، مسلم، سکھ عیسائی اردو دانوں کے درمیان یہ دستخطی مہم شروع کی اور جلد ہی تقریباً دس لاکھ اردو دانوں کے دستخط اس نے جمع کرلیا اور 1954ء کے ماہ جون میں پٹنہ میں بڑے پیمانے پر ایک اردو کنونشن طلب کیا گیا،جس میں ریاست بہار کے تمام تعلیمی، ادبی، سماجی، تمدنی وغیرہ اداروں کے نمائندے اور کانسل اسمبلی، پارلیمنٹ، کانسل آف اسٹیٹ، لوکل باڈیز، ڈسٹرکٹ باڈیز، میونسپلٹیاں وغیرہ کے اردو داں نمائندوں کے علاوہ ہر طبقہ کے کثیر تعداد عوام وخواص کو اکٹھا کیا، جنھوں نے ریاستی انجمن کے پیش کردہ علاقائی زبان کے مطالبے کی توثیق کی جس کے بعد محضر نامہ تیار ہوا۔صدر جمہوریہ سے وقت طلب کیا گیا اور کنونشن کی منظور کردہ تجویز کے مطابق بہار کے سرکردہ اہل رائے ونمائندہ حضرات کا ایک وفد محترمہ لیڈی انیس امام صاحبہ ایم ایل سی کی قیادت میں دس لاکھ دستخطوں اور محضر نامہ کے ساتھ 24 فروری 1956ء کو صدر جمہوریہ سے ملا اور ان سے اردو کو علاقائی زبان کی

دستوری حیثیت دینے کی گزارش کی۔صدر جمہوریہ نے ہمدردانہ طور پر وفد کے مطالبے کو سنا اور اس پر غور کرنے کا وعدہ فرمایا۔ بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کو یقین ہے کہ دیر یا سویر اہل اردو کا یہ جمہوری مطالبہ منظور کیا جائے گا۔ کیوں کہ دس لاکھ دستخطوں کے حصول کے ساتھ ہی ساتھ ریاست بہار کے گوشے گوشے میں جو عظیم بیداری اردو دوستوں میں پیدا ہوگئی ہے اس جمہوری دور میں اسے زیادہ دنوں تک نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے اور یہ اردو کی پہلی اور سب سے بڑی کامیابی ہے۔

بہار ریاستی انجمن ترقی اردو نے کسی بھی موقع کو رائیگاں نہیں کیا ہے۔جس میں اردو اور ریاست بہار کی خدمت کی گنجائش تھی۔انجمن کا ایک وفد حکومت ہند کے سرحدی تنظیم نو کمیشن سے ملا اور ممبران کمیشن سے یہ مطالبہ کیا کہ کشن گنج کے باشندوں کی نمایاں اکثریت کی مادری زبان اردو ہے اور اس اعتبار سے اس علاقہ کو بہار کے اندر رہنا چاہیے تھا، کیوں کہ اس ریاست میں اردو کی تعلیم کی سہولتیں بہرکیف کچھ ہیں۔ کمیشن نے ہمارے مطالبے کی صداقت کو تسلیم کیا کہ کشن گنج کی مادری زبان اردو ہے لیکن نہ معلوم کن اسباب کی بنا پر اہل اردو کا یہ جائز مطالبہ پورا نہ ہوا۔ پھر بھی کمیشن نے یہ سفارش ضرور کی کہ ہماری ہمسایہ ریاست بنگال کشن گنج کے باشندوں کی مادری زبان کا خاص لحاظ ضرور رکھے اور اس طرح دوسری شکل میں بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی کوشش ضرور بارآور ہوئی کہ ہمسایہ ریاست میں اردو کی ایک آئینی حیثیت پیدا ہوگئی۔ مارچ 1956ء میں ریاستی انجمن ترقی اردو کے ایک وفد نے حکومت ہند کے حق میں خوشگوار اثر بھی مرتب ہوا۔اس سے پہلے سال بھی بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کا ایک وفد جناب رفیع احمد قدوائی مرحوم وزیر خوراک کی خدمت میں پہنچا تھا جس نے مرکزی حکومت کے محکمہ مواصلات کے تحت مقابلہ کے امتحان میں اردو داں امیدواروں کے ساتھ جو ناانصافی کا پہلو نکلتا تھا اسے دور کرنے کی گزارش کی۔

بہار ریاستی انجمن ترقی اردو نے ریاست میں اردو لائبریریوں کی تنظیم کے لیے بھی سعی پیہم کی اور وقتاً فوقتاً حکومت بہار کی بھی توجہ دلاتی رہی کہ اردو کتابوں کی خریداری کے سلسلے میں ریاستی لائبریری کمیٹی انصاف سے کام لیا کرے اور اردو کتابوں کی خریداری تناسب کے لحاظ سے ہو۔ اردو لائبریریوں کے حقوق کی حفاظت وبقا کے لیے اس کی کوشش سے ایک

ادارہ بہار ریاستی اردو لائبریری ایسوسی ایشن کا قیام بھی عمل میں آیا جو اردو لائبریریوں کی فلاح و بہبود کے مسئلہ پر برابر جدو جہد میں مصروف ہے۔

انجمن نے ریاست بہار کے کالجوں، اسکولوں اور مکتبوں میں اردو تعلیم کے متعلق مناسب اور ضروری انتظامات کے لیے صاحبانِ اختیار سے ملاقاتیں کیں اور ان کی خدمات میں عرضداشتیں پیش کیں مثلاً انجمن کا ایک وفد وائس چانسلر بہار یونیورسٹی سے اس غرض کے لیے ملا کہ جن کالجوں میں اردو کی تعلیم کا مناسب انتظام نہیں ہے وہاں فوراً انتظام کیا جائے۔ چنانچہ یونیورسٹی مذکور کے رجسٹرار نے اپنے ایک حالیہ خط مورخہ 16 جنوری 1957ء لیٹر 16151 / اے، میمو 1616,58 / اے. کے ذریعہ جو تفصیلی اطلاع بھیجی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یونیورسٹی کے ذمہ داروں نے ہمارے مطالبات کو نظر انداز نہیں کیا ہے بلکہ جلد ہی اس نے ہمدردانہ قدم اٹھایا ہے۔ چنانچہ یونیورسٹی مذکور کی ارسال کردہ اطلاع کے مطابق اس کے کل 53، ملحقہ کالجوں میں سے اب تک 43، کالجوں میں اردو کمپوزیشن اور 29، کالجوں میں پرنسپل اردو کی تعلیم کا سامان ہو چکا ہے اور اس نے وعدہ کیا ہے کہ تمام شکایات دور کرنے کی کوشش کو تیز کر دیا جائے گا اور یونیورسٹی سے ملحق کالجوں کی فوری اقدام کے لیے ہدایت کر دی جائے گی۔

ریاستی انجمن ترقی اردو کے ایک نمائندہ نے ہمارے محبوب وزیر اعلیٰ ڈاکٹر شری کرشن سنہا اور وزیر تعلیم بدری ناتھ ورما سے بھی 25 مئی کو ملاقات کی اور ان کی خدمت میں ان ساری دقتوں، ضرورتوں اور حق تلفیوں کو واضح طور پر پیش کیا جو اردو تعلیم کے سلسلے میں مکتبوں، اسکولوں، ٹریننگ سنٹروں (تربیتی مراکز) اور دوسرے محکموں میں پیش آ رہی ہیں۔ اس سلسلے میں انجمن نے دوبارہ 29 اگست کو وزیر اعلیٰ بہار کی خدمت میں ایک طویل عرضداشت بھی پیش کیا۔ چنانچہ ہماری شکایت کے ازالہ کے لیے 31/ اگست 1956ء کو تعلیمی دفاتر کے افسروں کی ایک کانفرنس وزیر اعلیٰ بہار موصوف نے طلب کی اور عرضداشت کی روشنی میں انہوں نے بڑی ذمہ داری کے ساتھ متعلقہ افسران کو اردو کے مسئلہ کی طرف توجہ دلائی۔ مگر افسوس ہے کہ بعض ذمہ دار افسران اعلیٰ اپنے غیر ہمدردانہ رویہ کی تحت غلط رپورٹس پیش کیں اور اردو کے ساتھ انصاف کی راہ میں رکاوٹ بنے۔ مگر ہمیں یقین ہے کہ اردو جو کہ ایک متحدہ کلچر کی یادگار ہے اور ہندوستانی قوموں کے اتحاد کی

واحد نشانی اور صدیوں سے بہار کے عوام کے ذہن و دماغ میں جگہ بنائے ہوئے ہے جلد ہی یہاں اپنا جائز مقام حاصل کر کے رہے گی۔

بہار ریاستی انجمن ترقی اردو نے گزشتہ پانچ سال کی قلیل مدت میں جو جدوجہد کی وہ در اصل بہار میں اردو کی پانچ سالہ روشن تاریخ کی حیثیت رکھتی ہے جسے کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال تنظیمی کاموں اور آئینی کوششوں کے علاوہ بھی بہار میں اردو کے متعلق دوسرے کام انجام پائے ہیں اور اس طرح اردو نے یہاں روشن مستقبل کی طرف ٹھوس اور واضح قدم بڑھانے کی سعی کی ہے خواہ وہ تعلیمی شعبہ ہو یا صحافتی یا نشر و اشاعت کا شعبہ ہو یہ واقعہ ہے کہ اس مدت میں اردو ترقی کی منزلیں طے کرتی ہی گئی ہے۔

گزشتہ پانچ سالوں میں اردو کے تحقیقی کاموں اور اعلیٰ تعلیم کی صورتیں بھی بروئے کار آئیں۔ پٹنہ یونیورسٹی کے اکیڈمک کونسل نے اردو میں ڈاکٹریٹ کی سند دینی منظور کی جس کے تحت اردو میں اعلیٰ تحقیقاتی کاموں کا دروازہ کھل گیا ہے اور یہ کام تیزی سے انجام پانے لگا ہے۔ بہار مدرسہ اکزامینیشن بورڈ نے بھی اردو ایم اے کے مساوی فاضل اردو کی سند دینے کی تجویز 1954ء میں منظور کی اور اس کے دوسرے سال سے ہی وہاں امتحانات بھی ہونے لگے ہیں۔ اسی طرح بہار میں جامعہ اردو علی گڑھ کے امتحانات کا مرکز بھی قائم ہو چکا ہے اور ان تمام اداروں سے اردو کی دلدادہ طلبا نے بہت زیادہ دلچسپی لینا شروع کر دیا ہے۔ اردو کی ابتدائی تعلیم کے لیے بھی بے شمار اردو مکاتب اور اردو کے شبینہ تعلیمی ادارے سینکڑوں کی تعداد میں قائم ہو چکے ہیں۔ سینکڑوں اردو لائبریریاں ریاست بہار کے گوشے گوشے میں کھل چکی ہیں جس سے اردو حضرات فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ لاتعداد نئی انجمنیں اردو کو فروغ دینے کی فرائض انجام دے رہی ہیں۔

اس مدت میں اردو زبان کی نشر و اشاعت کا کام بھی بہار میں بہت تیزی کے ساتھ آگے بڑھا ہے اور سینکڑوں قابل قدر تصانیف زیور طبع سے آراستہ ہو کر اردو کے شیدائیوں سے داد تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ اردو کتابوں کی طباعت و اشاعت اور تصنیف و تالیف کے سلسلے میں 'اقبال بک ڈپو'، 'کتاب منزل'، 'اشاعت گھر'، 'مکتبہ ادب اردو مرکز'، 'مکتبہ دین و دانش'، 'شاہد بک ڈپو'، 'انجمن گلزار ادب'، 'بزم شاد'، 'اقبال پبلیشنگ ہاؤس' وغیرہ کے علاوہ جمشید پور

میں ’امر سنگھ کتاب گھر‘ اور پورنیہ وغیرہ جیسی دور دراز جگہوں میں بھی مختلف ادارے کافی کام کررہے ہیں۔ نیز مذہبی تصنیفات وتالیفات کے وافر سرمائے اس کے علاوہ ہیں۔ لہٰذا اردو کے متعلق بہار کے عوام میں اس پانچ سال کی قلیل مدت میں جو عظیم بیداری پیدا ہوئی ہے اس کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ براہ راست یا بالواسطہ طور پہ اس عظیم بیداری میں بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کو دخل نہیں ہے؟

صحافتی شعبہ میں بھی اس مدت میں اردو نے کافی ترقی کی ہے۔ پانچ سال پہلے صرف دو روزنامہ اور دو تین ہفتہ وار رسالے اور اخبار بہار میں اردو صحافت کی پوری کائنات تھی۔ مگر اس پانچ سال میں اگرچہ کئی ماہ نامے جاری ہوئے اور بند ہوگئے پھر بھی وہ اپنا اثر چھوڑ گئے۔ ماہنامہ ’تہذیب‘ اور ’معاصر‘ کی خدمات کو کون بھلا سکتا ہے۔ اس وقت بھی ماہنامہ ’مصور‘ اور ماہنامہ ’رضوان‘ کے علاوہ تقریباً ایک درجن ہفتہ وار اور روز نامے کی صورت میں اخبارات نکل رہے ہیں اور اردو کے مقاصد کو تقویت پہنچا رہے ہیں۔

یوپی میں اردو پر اگر وحشیانہ حملے ہو رہے ہیں تو وہ حملہ آور اردو کے کھلے محاذ ہیں بہار میں اگر دفاتر میں اردو پر نیم وحشیانہ حملے کی منصوبے بنائے جاتے ہیں تو منصوبہ بنانے والے اردو مخالفین کی صف میں شامل ہیں اور سب لوگ ان کو پہچانتے ہیں۔

بہر حال! اردو کی ترقی اور توسیع واشاعت میں ادبی کانفرنسوں اور مشاعروں کو بھی کافی دخل رہا ہے۔ جو اس پانچ سال میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ بہار کے گوشے گوشے میں انجام پا کر اردو کی دل کشی کا باعث بنے ہیں اور ابھی چند روز ہوئے کہ بہار کے اردو دوست طلبا نے اردو کنونشن منعقد کر کے اردو کے مسائل حل کرنے میں اپنی جو دلچسپی دکھلائی ہے وہ تازہ ثبوت ہے لیکن ابھی اردو کے تحفظ وبقا اور اسے ترقی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچانے کے لیے بڑی کاوشوں اور کوششوں کی ضرورت ہے جس کی طرف اردو دوستوں کو خاص توجہ دینی ہوگی:

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دل سوزی پروانہ ہے

(ہفتہ وار ’’سنگم‘‘ 26 جنوری 1957ء)

’’معمارِ قوم شاہ محمد زبیر‘‘
بیتاب صدیقی کی تاریخی تصنیف

پیش مطالعہ

’معمارِ قوم شاہ محمد زبیر‘ بیتاب صدیقی کی تصنیف ہے جو 1990ء میں منظر عام پر آئی۔ 216 صفحات پر مشتمل اس کتاب کا مفصل مقدمہ تقی رحیم نے لکھا ہے جو ہندوستان کی آزادی میں بہار کے مسلمانوں کے کارناموں اور ان کی قربانیوں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اس موضوع پر 599 صفحات پر مبنی ان کی کتاب ’تحریک آزادی میں بہار کے مسلمانوں کا حصہ‘ مطبوعہ خدا بخش پبلک اورینٹل لائبریری پٹنہ (1998ء) سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

’معمارِ قوم شاہ محمد زبیر‘ کے ’مقدمہ‘ کے آغاز میں تقی رحیم نے اپنے اس درد و کرب کا اظہار کیا ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کے عظیم الشان کارنامے کا صحیح تصور اور حقیقی شعور اب تک موجودہ سیاسی، سماجی اور سرکاری حلقوں میں نہیں پایا جاتا ہے۔ اس پر ستم یہ کہ اس اہم موضوع سے ملک کی ایک بڑی اکثریت نے نہ یہ کہ چشم پوشی کی ہے بلکہ بعض متعصب مورخین انہیں مسخ کرنے اور صفحہ تاریخ سے مٹانے میں لگے ہیں۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ تقسیم ہند کی تمام تر ذمہ داریاں مسلمانوں کے سر منڈھ دی گئیں اور یہی منفی طرز عمل نئی نسلوں کے ذہن میں زہر کی طرح سرایت کرادیا گیا جس نے ہندوستان کی آزادی میں مسلمانوں کی غیر معمولی قربانیوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ البتہ تاریکیوں میں روشنی کی کرنیں وہ چند غیر متعصب دانشور، مورخ، مصنف، مدبر اور صحافی ہیں جنہوں نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کے کارناموں کا نہ صرف غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا بلکہ بڑی وسعت نظری اور روشن خیالی سے ان کا اظہار بھی کیا۔ ان ہی حضرات کے منصفانہ طرز عمل نے وہ مواد فراہم کیا کہ اس موضوع پر متعدد کتابیں اور تحریریں منظر عام پر آئیں۔

اگرچہ اس موضوع پر ابھی بھی لگاتار لکھتے رہنے اور اس تناظر میں بہار کے مسلمانوں (خواتین

سمیت) کے نا قابل فراموش کارناموں کومختلف زبانوں میں منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے تا کہ آزادی کے بعد کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والی نسلوں کوان سے متعارف کرایا جا سکے۔ بقول تقی رحیم:

''بہار ہی وہ واحد صوبہ ہے جہاں کے مسلمانوں نے 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد اپنے صوبہ کے ہندو بھائیوں سے بھی آگے بڑھ کر تحریک آزادی میں حصہ لیا...... اور سب سے زیادہ قربانی بھی انہوں نے ہی دی تھی ...... سچائی یہ ہے کہ ماڈرن بہار کی تشکیل وتعمیر میں اصل ہاتھ مسلمان رہنماؤں کا ہی ہے''۔

(معمار قوم......ص:9)

اگرچہ بہار کے کچھ مجاہدین آزادی کے کارناموں پر مبنی تحریروں اور کتابچوں کی اشاعت ہوئی ہے لیکن یہ انتہائی تشنہ اور زیادہ تر اردو میں ہونے کی وجہ سے غیر معروف ہیں اور ان کے قارئین کا حلقہ بھی برائے نام ہے۔ البتہ اس سلسلے میں ایک اہم کارنامہ بیتاب صدیقی جیسے سن رسیدہ اور کہنہ مشق اہل قلم کا ہے جنہوں نے شاہ زبیر کے حیات وکارنامے پر مبنی ایک جامع اور مفصل کتاب لکھی جس کی تصنیف کے وہ صحیح معنوں میں اس لیے بھی مستحق تھے کہ انہیں شاہ زبیر کے چھوٹے بھائی شاہ محمد عمیر اور ان کے خلف رشید شاہ محمد مشتاق سے قربت اور ان کے رفیق خاص ڈاکٹر سید محمد محمود اور پروفیسر عبدالباری کے ساتھ کام کرنے کا امتیاز حاصل رہا۔

شاہ محمد زبیر کا خاندانی پس منظر انتہائی تابناک اور پروقار رہا ہے۔ ان کا سلسلۂ بیعت حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے خالہ زاد بھائی مخدوم تیم اللہ چشتی کے خلیفہ مجاز مخدوم شمس الدین سمن کے چھوٹے بھائی حضرت شاہ خلیل الرحمٰن سے ملتا ہے۔ اس خانوادہ میں دینی وعصری تعلیم کے ساتھ جاگیرداری کی بخشی ہوئی خوشحالی بھی تھی۔ چنانچہ ایک طرف جہاں متصوفانہ جمال وکمال تھا تو دوسری جانب زمیندارانہ جلال اور شان وشوکت بھی۔ شاہ محمد زبیر (1884-1930ء) نے ارول کے جس خانوادہ اور خطے میں آنکھیں کھولیں وہ بزرگان دین اور تصوف کی آماجگاہ کے ساتھ 1857ء کی جنگ آزادی کے مجاہدین کا مرکز بھی رہا ہے۔ اس زمانے میں برطانوی سامراجیت کے خلاف چہارسو علم بغاوت بلند تھا۔ جس نے شاہ صاحب کے ذہن کو مہمیز لگانے کا کام کیا۔ یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ 1911ء میں لندن میں ان کی بیرسٹری کی تعلیم کے دوران مغربی تہذیب کے سیل رواں میں بہنے اور ان پر کیف فضاؤں سے لطف اندوز ہونے کی بجائے وہاں کے جمہوری اقدار اور آزادانہ سیاسی شعور نے انہیں قومیت اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار

کر دیا۔ انہیں خیالات وکیفیات کو وہ اپنے ذہن ودل میں پرورش کرتے ہوئے ہندوستان واپس آئے۔ یہاں واپسی کے بعد انہوں نے وکالت اور سیاست میں ایک ساتھ قدم رکھ دیا۔ اس زمانہ میں خلافت ہو کہ لیگ اور کانگریس، سبھوں کا مقصد آزادی ہند اور برطانوی سامراجیت کا خاتمہ کر کے ہی چین لینا تھا۔ شاہ محمد زبیر نے کانگریس کو ایک حد تک اپنے ذہن ومزاج سے ہم آہنگ پایا، چنانچہ 1912ء میں انہوں نے کانگریس کی رکنیت اختیار کی اور اسی سال پٹنہ میں منعقدہ کانگریس کی صوبائی کانفرنس میں مجلس استقبالیہ کے چیف آرگنائزر کی حیثیت سے اپنی بہترین کارگزاریوں کا ثبوت دیا۔ 1914ء میں اپنی شادی کے بعد کہنے کو تو مونگیر منتقل ہو گئے مگر وہیں سے قومی سیاست کے مین اسٹریم میں کود پڑے۔ ادھر ہندوستان کو برطانوی حکومت کے ذریعے خود اختیاری دینے کی بجائے جلیان والا باغ کا سانحہ اور رولٹ ایکٹ جیسا ظالمانہ قانون دیا گیا جس نے یہاں کی عوام کو زبردست ہیجانی کیفیت سے دوچار کر دیا۔ ان صورت حال کو دیکھتے ہوئے گاندھی جی نے ہندوستانیوں کو ستیہ گرہ اور عدم تعاون پالیسی پر گامزن ہونے کا مشورہ دیا۔ ان دنوں شاہ زبیر مونگیر میں سیاست کے ساتھ وکالت بھی کر رہے تھے۔ لیکن بہت جلد وکالت ترک کر کے پوری طرح ستیہ گرہ اور عدم تعاون تحریک کو آگے بڑھانے کے شعوری فیصلے کے ساتھ میدان میں کود پڑے۔ چونکہ کچھ لوگ تحریک کی مخالفت میں بھی تھے چنانچہ تحریک کی حمایت میں بھاگلپور میں ایک دوروزہ صوبائی کانفرنس منعقد کی گئی جس کی سہ نفری کمیٹی میں مولانا مظہر الحق، ڈاکٹر راجندر پرساد اور شاہ محمد زبیر بھی تھے۔ اس دوروزہ اجلاس میں شاہ زبیر کی دلسوز تقریر کا سامعین کے دلوں پر بڑا گہرا نقش مرتب ہوا اور تحریک کی حمایت میں ایک نئی فضا قائم ہوئی۔ گاندھی جی مولانا شوکت علی کے ساتھ جب بہار کے دورہ پر نکلے تو مونگیر میں وہ شاہ صاحب کے مہمان ہوئے اور ان کے ساتھ کئی جلسوں کو خطاب کیا۔

شاہ زبیر کے تعلقات ملک کے سرکردہ سیاست دانوں، دانشوروں اور مجاہدین آزادی سے برابری کی سطح پر تھے۔ بہار میں شاہ زبیر کا سسرالی مکان (مونگیر) تحریک آزادی کا اہم مرکز بنا رہا۔ شاہ صاحب اور شری کرشن سنہا کو مونگیر میں انہیں کی کوٹھی سے حراست میں لیا گیا تھا۔ جیل سے رہائی (1923ء کے بعد) کسانوں کے مسائل کے حل کے لیے 'کسان سبھا' کی تشکیل شاہ صاحب کے ذہن کی ہی پیداوار تھی جو آگے چل کر ملک سے زمیندارانہ نظام کے خاتمے کا سبب بنی۔ گاندھی جی ودیگر قائدین کے دورے نے عدم تعاون تحریک میں ایک نئی جان ڈال دی۔ البتہ لوکل باڈیز کو اس سے مستثنیٰ رکھا گیا تھا۔ چنانچہ 1923-24ء میں جب اس کا انتخاب عمل میں آیا تو کانگریسیوں کی آپسی ریشہ دوانی کھل کر سامنے آ گئی،

لیکن مونگیر ضلع میں شاہ صاحب کی مدبرانہ قیادت کی وجہ سے یہاں معاملے نے زیادہ طول نہیں پکڑا اور جہاں بہار بھر کے صف اوّل کے متعدد قائدین کو انتخاب میں ناکوں چنے چبانے پڑے وہیں شاہ محمد زبیر آسانی سے کامیاب ہوئے اور وہ ڈسٹرکٹ بورڈ مونگیر کے چیئرمین منتخب ہوئے جب کہ شری کرشن سنہا وائس چیئرمین ہوئے۔ اس مثالی بورڈ کی ستائش ڈاکٹر راجندر پرساد نے بھی کی تھی۔

1925ء میں پرولیا میں منعقدہ تاریخی صوبائی کانفرنس کی صدارت شاہ محمد زبیر نے ہی کی تھی جس میں گاندھی جی بطور خاص شریک ہوئے تھے۔ اس کانفرنس کی کامیابی کا سہرا بھی بہت حد تک انہیں کے سر تھا۔ اس موقع پر ان کا مفصل خطبۂ صدارت اور پھر پریس کانفرنس کی روداد آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہے جس کی سیاسی و تاریخی حیثیت کا انکار آج بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ شاہ صاحب کی ہمہ گیر شخصیت او ردانشورانہ سیاسی و ملی بصیرت کے پیش نظر موتی لال نہرو نے 1926ء میں انہیں اسٹیٹ آف کونسل کے انتخاب کے لیے امیدوار بنایا جس میں انہیں کامیابی ملی، بعد میں قومی مفاد میں وہ رکنیت سے مستعفی ہوگئے۔ شاہ زبیر مولانا آزاد کی طرح اکثریت اور اقلیت کے غیر منصفانہ نظریہ کے خلاف تھے۔ انہوں نے مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے ہی نہرو رپورٹ کی تائید کی تھی جس کی ملک گیر سطح پر زبردست مخالفت کی گئی تھی۔ شاہ محمد زبیر نے ملی، سماجی، سیاسی و اصلاحی محاذ پر بے شمار خدمات انجام دیں۔ سول نافرمانی کی تحریک میں بھی وہ پیش پیش رہے۔ اسی کے ساتھ وہ ملک میں تعلیم نسواں کے زبردست حامی اور بچوں کی شادی کے سخت مخالف تھے۔ وہ انتہائی محرک، فعال اور زبردست قائدانہ صلاحیتوں کے مالک تھے، چنانچہ ان کے احباب و معاصرین کے علاوہ بزرگ رہنما و قائدین بھی ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کے قائل اور معترف تھے اور انہیں عقیدت و احترام کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔

افسوس کہ قید زنداں میں ان پر جو گزری اس سے ان کی صحت بہت متاثر ہوئی اور صرف چھیالیس سال کی عمر میں اس دارِفانی سے کوچ کر گئے۔ صد حیف کہ ملک ایک ممتاز قائد اور مدبر سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگیا:

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انساں نکلتے ہیں

ضرورت ہے کہ شاہ محمد زبیر کے عظیم الشان کارناموں سے عوام الناس کو روشناس کرایا جائے۔
اگلے صفحات پر بیتاب صدیقی کی کتاب 'معمارقوم شاہ محمد زبیر' کی تلخیص وتہذیب ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

معمارقوم شاہ محمد زبیر

(تلخیص وتدوین)

شاہ محمد زبیر کا سلسلہ نسب حضرت مخدوم شاہ شمس الدین سمن ارولی کے چھوٹے بھائی حضرت مخدوم شاہ خلیل الرحمٰن ارولی سے ملتا ہے۔ جب کہ نانیہالی نسبت حضرت مخدوم برہان الدین فردوسی ٹکاری، ضلع گیا سے ہے جو حضرت کبیر اولیاء پانی پتی کی اولاد میں ہیں۔ شاہ زبیر کے جد امجد شاہ مہدی علی کا سلسلہ حضرت مخدوم سید شرف الدین احمد منیری بہاریؒ کی پوتی بی بی پارکہ سے ہے۔ اس طرح شاہ محمد زبیر کا دادیہالی اور نانیہالی شجرہ دوسلاسل کے اولیاء اور علماء سے منسوب ہے۔

شاہ محمد زبیر کی پیدائش ارول (قدیم ضلع گیا) میں 1884ء میں ہوئی۔ ان کے والد شاہ اشفاق حسین (متوفی 1913ء) ولد شاہ امداد حسین ایک ذی علم صوفی اور زمیندار گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے تین بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ جن میں سب سے بڑے شاہ محمد زبیر تھے۔ خاندانی جاہ وحشمت، دولت وثروت اور اثر ورسوخ کے باعث سرکار بہادر نے شاہ اشفاق حسین کو آنریری مجسٹریٹ کا اعزاز بخشا۔ شاہ محمد زبیر کی ابتدائی تعلیم والد کے زیر نگرانی گھر پر ہوئی۔ 1904ء میں ٹی. کے. گھوش اکادمی، پٹنہ سے میٹرک کے بعد پٹنہ میں ہی مزید تعلیم حاصل کرکے بارایٹ لاء کرنے کے لیے 1908ء میں لندن روانہ ہوئے، جہاں سے سند یافتہ ہوکر 1911ء میں وطن واپسی ہوئی۔ ان کے قیام لندن کا قابل غور پہلو یہ رہا کہ وہاں سے واپسی کے ساتھ دل میں حب الوطنی اور انگریز مخالف جذبات سے سرشار لوٹے اور بعد میں یہاں کی قومی سیاست میں کود پڑے۔ انہوں نے شروع میں کچھ دن پٹنہ میں وکالت کی، لیکن یہ سلسلہ دو ڈھائی سال بعد ان کی مونگیر منتقلی کے ساتھ یہاں سے منقطع ہوگیا۔

سیاست کی دہلیز پر:

پٹنہ میں 1912ء میں کل ہند کانگریس کا 27واں اجلاس کانگریس کے صدر راؤ بہادر رگھوناتھ نرسنہا مدھولکر کے زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔ اس کی مجلس انتظامیہ کے چیف آرگنائزر شاہ محمد زبیر اور استقبالیہ کے صدر مولانا مظہر الحق تھے۔ کانگریس کی 27 سال کی تاریخ میں اس کا پہلا اجلاس بہار میں ہوا

تھا۔اس سے قبل کانگریس کی کسی اجلاس میں اتنی بڑی تعداد میں مسلمانوں نے شرکت نہیں کی تھی۔شاہ محمد زبیر کے سیاست میں آنے کے ان کے ذاتی رجحان کے علاوہ جو دو اہم محرکات کارفرما ہوئے ان میں ایک جسٹس شرف الدین کی قربت اور دوسری جنگ بلقان (13-1912ء) تھی۔جس کے خلاف ملک بھر میں بالعموم اور مسلمانوں میں بالخصوص غم وغصہ کی شدید لہر تھی۔اس جنگ میں خلافتِ عثمانیہ کے قبضے سے بلقان کی ریاستیں نکل گئی تھیں۔اُسی سال 1913ء میں شاہ محمد زبیر کے والد کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد والدہ نے ان کی شادی شاہ محمد ایوب مونگیریؒ کی صاحبزادی سے کردی۔حضرت مونگیری کے اصرار پر 1914ء سے انہوں نے مونگیر میں مستقل بودوباش اختیار کرلی، جہاں کچھ دنوں تک وکالت بھی کی اور اس حیثیت سے بھی کافی شہرت پائی مگر جلد ہی وکالت سے دستبردار ہوگئے اور تن من دھن سے ملی، سماجی وسیاسی سرگرمیوں میں منہمک ہوگئے۔

مونگیر۔میدان عمل:

انگریزی سامراجیت کے خلاف ملک میں ناراضگی اور صف اوّل کے سیاسی اور مذہبی علماء کی صف آرائیوں نے شاہ محمد زبیر کو بھی کافی مضطرب وپریشان کر رکھا تھا۔ چنانچہ وہ پوری طرح میدان سیاست میں کود پڑے۔ 13-1912ء کے آس پاس ملک میں ایک کے بعد ایک متعدد حادثات وواقعات رونما ہوئے۔ جنگ بلقان کے اثرات، مولانا ابوالکلام آزاد کے 'الہلال' (1912ء) اور 'البلاغ' (1915ء) نے تعلیم یافتہ مسلمانوں بالخصوص نوجوانوں میں ایک نئی روح پھونک دی اور ملک میں پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندومسلم اتحاد کی ایک نئی فضا قائم ہوئی۔خلافت اور کانگریس کی تحریک ایک متحدہ پلیٹ فارم پر آگئی اور 1916ء تک دونوں سیاسی نقطۂ نظر سے بہت قریب ہوگئے۔جلیان والا باغ کا سانحہ اور رولٹ ایکٹ کے نفاذ سے ملک کا ایک ایک ہندوستانی ہراساں وپریشاں تھا۔ادھر گاندھی جی نے تحریک عدم تعاون بھی شروع کر رکھی تھی۔ 16-1915 سے پہلے ہی نرم دل اور گرم دل کی قیادت دو حصوں میں تقسیم ہوچکی تھی۔ 1917ء میں مہاتما گاندھی نیل کی کھیتی کرنے والے کسانوں کی حمایت میں چمپارن مارچ کرچکے تھے۔اس کے بعد 1918ء میں گجرات میں کھیڑا کسانوں کا معاملہ بھی اٹھا چکے تھے جو چمپارن تحریک کے بعد ملک کی دوسری سب سے اہم تحریک تھی۔انہوں نے 1919ء میں برطانوی حکومت کے خلاف عدم تشدد یعنی ''اہنسا'' کا انوکھا تصور پیش کیا جس میں شاہ محمد زبیر، راجندر پرساد، مولانا مظہرالحق، پروفیسر عبدالباری جیسے لوگوں نے قائدانہ کردار ادا کیا۔ادھر شاہ زبیر کی زبردست صلاحیت اور

ان کی فعالیت کی وجہ سے خلافت مومنٹ آزادی ہند کی تحریک بن چکی تھی۔شری کرشن سنہا کی شاہ زبیر سے بڑھتی قربت کا نتیجہ تھا کہ 1920ء میں مسلمانوں کے ایک جلسہ عام سے خطاب کرنے کے لیے وہ شری بابو کو اپنے ساتھ لیے مونگیر کی جامع مسجد پہنچ گئے جہاں حاضرین کے خاموش احتجاج کے باوجود انہوں نے اپنی تقریر سے سامع کا دل ہی نہیں اعتماد بھی جیت لیا۔ جلسے کے بعد یہی مجمع ایک بڑے جلوس میں تبدیل ہوگیا۔شری کرشن سنہا کے سیاسی کیریئر کو آگے بڑھانے میں شاہ محمد زبیر نے بڑی فیاضی اور دوراندیشی سے کام لیا۔انہیں مونگیر میں واقع اپنی رہائش گاہ پر گاندھی جی سے سب سے پہلی مرتبہ شاہ صاحب نے ہی متعارف کرایا تھا۔جس کے شری کرشن سنہا خود معترف ہیں:

> ''گاندھی جی سے میری ملاقات سب سے پہلے شاہ محمد زبیر کی کوٹھی واقع ضلع مونگیر میں ہوئی تھی اور شاہ محمد زبیر نے بڑے ہی شفقت اور پرخلوص جذبے کے ساتھ گاندھی جی سے میرا تعارف کرایا تھا۔''
>
> (معمارِقوم......ص:57)

یہ شاہ زبیر کے تعمیری ذہن کا نتیجہ تھا کہ مونگیر میں کانگریس کا سب سے پہلا ضلعی دفتر ان کی کوٹھی پر قائم ہوا تھا۔ بھاگلپور میں منعقدہ جس بہار سیاسی کانفرنس کا افتتاح راجندر پرساد نے کیا تھا اس کی تجویز وتائید شاہ صاحب نے پیش کی تھی اور جلسہ کو خطاب بھی کیا تھا۔اس تاریخی جلسہ میں جو تجاویز منظور ہوئیں ان کی شق نمبر2 کی رو سے بہار میں تحریک عدم تعاون اور تحریک موالات کے فروغ کے لیے جو سہ نفری کمیٹی تشکیل دی گئی اس میں شاہ صاحب کے علاوہ راجندر پرساد اور مولانا مظہرالحق شامل تھے۔دسمبر 1920ء میں کانگریس کے ناگپور اجلاس میں جب ان دونوں تحریکات کو باقاعدہ شامل کرلیا گیا تو گاندھی جی نے مونگیر ضلع کی تمام تر ذمہ داریاں شاہ صاحب کے سپرد کردیں۔اسی کے ساتھ انہیں بہار صوبائی کمیٹی کا رکن بھی منتخب کیا گیا۔شاہ صاحب نے تحریک کے فروغ کے لیے ایسی جدوجہد شروع کی کہ مونگیر ضلع کے علاوہ پورے صوبے کے طلبہ وطالبات اسکول وکالج اور سرکاری ملازمین اپنی ملازمت چھوڑ کر تحریک میں شامل ہونے لگے۔جب کہ علماء ودانشوران اپنے اعزازات، القاب وخطابات سرکار کو واپس کر کے دیوانہ وار عدم تعاون اور ترک موالات کے دست وبازو بننے لگے۔اس مشن کے لیے دسمبر 1920ء میں گاندھی جی کی قیادت میں ایک نمائندہ تاریخی وفد مونگیر کے دورہ پر نکلا اور شاہ زبیر کا مہمان ہوا۔گاندھی جی کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد، لالہ لاجپت رائے، مولانا شوکت علی، بی اماں وغیرہ جیسی مقتدر ہستیوں کا قیام مونگیر

قلعہ کے اندر شاہ زبیر کی کوٹھی پر ہوا تھا۔ شوکت علی کی پہلی سیاسی تقریر مونگیر میں ہی ہوئی تھی۔ یہ شاہ زبیر کی قائدانہ صلاحیتوں کا ہی کرشمہ تھا کہ ان رہنماؤں کے ایک ہفتہ مونگیر میں قیام کے دوران تحریکی سرگرمیاں، جلسہ وجلوس اور لوگوں کے جوش وخروش کی گونج پورے صوبے میں سنائی دینے لگی تھی۔ واضح ہو کہ گاندھی جی سے شاہ زبیر کی پہلی ملاقات ان کے مونگیر دورے کے موقع پر ہوئی تھی جو تادم مرگ دونوں رہنماؤں کے درمیان اعتماد واتحاد کے مضبوط رشتے پر قائم رہی۔ مونگیر میں شاہ زبیر کی قیادت کے اثرات کو دیکھتے ہوئے گاندھی جی اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے صوبے بھر میں 'مونگیر ماڈل' اختیار کرنے کی ہدایت دی۔ اس زمانے میں شاہ زبیر کی کوٹھی کانگریس کا صدر دفتر بھی تھا اور قومی رہنماؤں کی قیام گاہ بھی۔ یہیں سے ساری سرگرمیاں شروع ہوتیں، یہیں سے لوگوں کی امداد بھی کی جاتی اور لنگر بھی تقسیم ہوتا۔ کہا جاسکتا ہے کہ کسی زمانے میں الہ آباد کے 'آنند بھون' کا جو مقام تھا وہی حیثیت مونگیر میں شاہ زبیر کی کوٹھی کو حاصل تھی۔ اسی کوٹھی سے شاہ صاحب کی قیادت میں ضلع بھر میں بدیسی ملبوسات کو نذر آتش کرنے کا لامتناہی سلسلہ چل پڑا تھا۔ جس میں مردوں نے جہاں اپنے قیمتی کپڑے جلائے وہیں خواتین نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ خود شاہ محمد زبیر کی اہلیہ نے اپنے ہاتھوں سے اپنے تمام بدیسی کپڑے جلا ڈالے۔ اس تحریک میں ان کے ساتھ علاقے کی دیگر عورتیں بھی شامل ہوئیں۔ اس 'جرم' میں انہیں انگریزوں کے ڈنڈے بھی کھانے پڑے۔

تعلیمی اداروں کا قیام:

تحریک عدم تعاون میں شاہ صاحب کے چھوٹے بھائی شاہ محمد عمیر نے سینٹ زیویئر کالج، کلکتہ میں اپنی پڑھائی چھوڑ دی۔ صوبہ بہار اور بالخصوص مونگیر میں ایک بہت بڑی تعداد میں اسٹوڈنٹس نے اپنی اپنی تعلیم گاہوں کا بائیکاٹ کیا۔ اس صورتحال کا مقابلہ اور متبادل تعلیمی نظام کے لیے شاہ صاحب نے متعدد اسکولوں اور کالجوں کی سرپرستی کی اور اپنی ذاتی ملکیت کا اچھا خاصا حصہ ان کے قیام واستحکام میں لگا دیا۔ انہیں کی مساعی جمیلہ سے 'قومی تعلیمی کونسل' بہار کا قیام عمل میں آیا۔ بہار میں تقریباً ڈیڑھ سو قومی اسکولوں، کالجوں اور ودیا پٹھوں کا قیام ان کی نگرانی میں ہوا۔ ان کے نظم ونسق کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی تھی اس میں شاہ زبیر کے علاوہ مولانا مظہر الحق، مولانا شفیع داؤدی، قاضی احمد حسین، شری کرشن پرکاش وغیرہ جیسی مقتدر شخصیتیں شامل تھیں۔

گورنر کی آمد پر ہڑتال:

عدم تعاون اور ترک موالات کی بڑھتی مقبولیت، اس کے عمل درآمد پر قابو پانے اور برطانوی مفاد کے نقصانات کو روکنے کے لیے حکومت برطانیہ نے ایک چال یہ چلی کہ ایک انگریز پرست ہندوستانی لارڈ سنہا کو بہار کا گورنر بنا دیا۔ فروری 1921ء میں گورنر لارڈ سنہا مونگیر کے دورہ پر پہنچا۔ جس کا شاہ زبیر کی قیادت میں مکمل بائیکاٹ کا اعلان کیا گیا۔ اس کی آمد پر لوگوں نے اسے سیاہ جھنڈے دکھائے اور اپنے اپنے گھروں پر سیاہ جھنڈے بھی نصب کیے۔ اس دن شہر میں مکمل ہڑتال رہی۔ کچھ عرصہ بعد انگریزی ولی عہد پرنس آف ویلز کے ہندوستانی دورے کی جب خبر آئی تو گاندھی جی نے اپنے اخبار 'ینگ انڈیا' میں اس کے مقاطعہ کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اس بائیکاٹ کو مؤثر اور کامیاب کرنے کے لیے آرہ میں جو صوبائی کانفرنس ہوئی اس میں شاہ زبیر نے بھی شرکت کی۔ اس کے بعد انہوں نے مونگیر ضلع اور اطراف میں گھوم گھوم کر پرنس ویلز کے دورے کے خلاف فضا ہموار کی۔ جس کے نتیجے میں ان کی گرفتاری عمل میں آئی۔ اس کے بعد سے اس سال کے آخر تک شاید ہی کوئی ایسا بااثر لیڈر بچ گیا ہو جسے حراست میں نہ لے لیا گیا ہو۔ 12 دسمبر 1921ء کی شب میں بہار میں جتنی گرفتاریاں ہوئیں ان کی تفصیلات پر مبنی فہرست 22 دسمبر 1921ء کے 'ینگ انڈیا' کے شمارے میں موجود ہے۔ شاہ محمد زبیر کی گرفتاری سے متعلق مذکورہ شمارے میں گاندھی جی نے لکھا تھا:

''شاہ محمد زبیر پر تخریبی کاموں کا الزام لگا کر ان کو گرفتار کرنا بالکل ناانصافی ہے''۔

گرفتار شدگان میں متعدد لوگوں کو ایک سال کی سزا ہوئی، مگر شاہ صاحب ان لوگوں میں تھے جنہیں دو سال تک قید زنداں کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ اپنی گرفتاری کی بامشقت مدت گزارنے کے بعد مارچ 1923ء میں انہیں گیا جیل سے رہائی ملی۔ کہا جاتا ہے کہ اسی دوران انہیں عارضہ قلب لاحق ہوا۔ مگر رہائی کے بعد بھی ان کی سرگرمیوں میں کوئی کمی نہیں آئی، بلکہ وہ پہلے سے زیادہ فعال اور متحرک ہو گئے اور آزادی کی جدوجہد کو مزید مستحکم اور آگے بڑھانے میں لگ گئے۔ چنانچہ موتی لال نہرو نے اپنی تشکیل کردہ 'سوراج پارٹی' میں انہیں بھی شامل کرلیا۔ یہ شاہ صاحب کی بے پناہ کوششوں کا ہی ثمرہ تھا کہ نومبر 1923 کے انتخاب میں 'سوراج پارٹی' کو بہار سے 12 نشستیں حاصل ہوئیں۔ یہاں یہ ذکر بیجا نہ ہوگا کہ بہار صوبائی کونسل کے انتخاب سے ٹھیک ایک ماہ پہلے اکتوبر 1923ء میں مونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے انتخابات ہوئے جن میں شاہ زبیر کی کوششوں سے کانگریس کو شاندار فتح حاصل ہوئی۔ اس انتخاب میں

خودشاہ زبیر اور شری کرشن سنہا بالترتیب مونگیر ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیئرمین اور وائس چیئرمین منتخب ہوئے۔
شاہ صاحب کی شاندار کامیابی پر ڈاکٹر راجندر پرساد کی یہ تحریر بڑی اہمیت کی حامل ہے:

''چیئرمین کے انتخاب میں واحد مسلمان جو کسی دشواری کے بغیر منتخب ہوئے وہ مونگیر میں شاہ زبیر تھے۔ یہ استثنیٰ صرف مونگیر ڈسٹرکٹ بورڈ کو حاصل رہا''۔

(آتم کتھا، ص:214، بحوالہ معمارِ قوم ص:75)

اس انتخاب میں مونگیر کے گوگڑی تھانہ (اب کھگڑیا ضلع) میں زبردست فوج کشی ہوئی، جس میں شری کرشن سنہا کو بھی ماخوذ کیا گیا۔ شاہ صاحب نے ان کے مقدمے کی خود پیروی کی تھی جس میں فیصلہ ان کے حق میں ہوا۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کا انتخاب تو ہو گیا مگر اس کے بعد بورڈ پر سرکار کا شکنجہ سخت ہونے لگا۔ چنانچہ انتخابات کے اخراجات پر جب آڈیٹر نے بل لایا تو اس کے خلاف پٹنہ میں ایک کانفرنس بلائی گئی جس کی صدارت ڈاکٹر راجندر پرساد اور افتتاح شاہ محمد زبیر نے کیا تھا۔ غرض شاہ زبیر کبھی تنہا اور کبھی دیگر قائدین کے ساتھ مل کر متعدد محاذ پر ڈٹے رہے اور اپنی شاندار حکمت عملی سے کئی کئی معرکے سر کئے۔ 5 دسمبر 1923ء کو جس مونگیر ضلعی سیاسی کانفرنس کی صدارت مولانا شوکت علی نے کی تھی اور جس میں بی اماں بھی شریک ہوئی تھیں اس کی کامیابی شاہ صاحب کی طلسماتی شخصیت کا کرشمہ تھی۔ اس کانفرنس سے حوصلہ پا کر مولانا شوکت علی نے شاہ زبیر کے تعاون سے دوسری کانفرنس جمال پور مونگیر میں رکھی۔ اس زمانے میں کانگریس، خلافت، لیگ، جمعیۃ سبھوں کا مقصد ایک اور منزل ملک کی آزادی تھی۔ یہ مختلف عقائد ونظریات کی حامل جماعتیں اپنا منفرد نقطہ نظر رکھتے ہوئے بھی حصولِ آزادی کے کارواں کو آگے بڑھانے کا ایک مشترکہ سیاسی پلیٹ فارم تھا، لیکن ستم ظریفی یہ کہ رفتہ رفتہ لوگ فرقہ وارانہ خطوط پر عصبیت اور تنگ نظری کا شکار ہوتے گئے۔ شدھی کرن سنگٹھن بھی ملک میں سر اٹھانے لگی۔ دوسری طرف انگریز ہر وہ طریقہ کار اختیار کر رہے تھے جس سے آپس میں اختلافات رونما ہو اور تحریک آزادی کمزور پڑے۔ شاہ زبیر کی فعالیت کو دیکھتے ہوئے مونگیر خاص طور پر ان کی نگاہوں میں تھا۔ چنانچہ 1924ء میں سیتامڑھی کے ایک سخت گیر انگریز ایس ڈی او جس کا نام Lie تھا اسے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ میں ترقی دے کر مونگیر بھیجا گیا۔ یہاں کی ذمہ داری سنبھالتے ہی وہ مونگیر ڈسٹرکٹ بورڈ کے معائنہ کے لیے ڈسٹرکٹ بورڈ کے دفتر آدھمکا۔ اس کی آمد کی اطلاع پا کر جب شاہ محمد زبیر اس کے استقبال میں اپنے دفتر سے باہر نہیں نکلے اور اپنے آڈرلی کے ذریعے سلام وکلام جیسے ابتدائی کلمات کا سلسلہ جاری رکھا جس سے وہ ان کے تیور کو بھانپ گیا اور کبیدہ

خاطر ہو کر وہاں سے واپس ہوا۔ اسی بیچ وہ شاہ زبیر سے متعلق اپنی معلومات میں ضروری اضافہ کرتا رہا۔ کچھ دنوں بعد جب مسٹر لی کی مونگیر کلکٹر کی حیثیت سے ڈسٹرکٹ بورڈ کی جائزہ رپورٹ سامنے آئی تو خلاف توقع اس نے رپورٹ انتہائی مثبت دی۔ بعد میں اس نے شاہ صاحب کو ایک گزارش نامہ ارسال کرتے ہوئے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اسے اپنی سہولت کے مطابق شرف ملاقات کا موقع بخشیں۔ اس کے بعد جب تک وہ مونگیر کا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ رہا شاہ صاحب سے ملاقات کے لیے ان کی کوٹھی پر برابر حاضر ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ ان کے اخلاق وکردار سے بہت متاثر ہوا اور انہیں کئی مواقع پر اپنے یہاں مدعو کیا مگر شاہ صاحب کبھی اس سے ملنے نہیں گئے تاکہ اس سے عوام میں غلط پیغام نہ چلا جائے۔

بیتاب صدیقی کی پیش نظر کتاب کے صفحہ 79 پر یہ انکشاف بھی ہے کہ مسٹر لی کی مونگیر میں تقرری کے زمانے میں شاہ صاحب کو 'سر' کے خطاب سے نوازانے کے لیے ان پر کافی ڈورے ڈالے گئے۔ مگر ہر بار سرکاری اہلکاروں کو نامرادونا کام ہونا پڑا۔ چنانچہ ردِّعمل کے طور پر ان کے خلاف حکومت کا رویہ اور سخت ہوتا چلا گیا۔ ادھر شاہ زبیر کے انگریز مخالف جذبے نے بھی مزید شدت اختیار کر لی۔

ہندوستان کی تحریک آزادی میں ایک نیا موڑ اس وقت آیا جب چوراچوری کے اندوہناک سانحہ کے بعد گاندھی جی نے ترک موالات تحریک واپس لے لیا۔ بریلی اور مدراس میں بھی تشدد آمیز واقعات رونما ہوئے۔ 'ینگ انڈیا' میں گاندھی جی کے لکھے ہوئے کچھ مضامین کا حوالہ دیتے ہوئے انہیں 22 مارچ 1922ء کو گرفتار کر لیا گیا، خرابی صحت کی وجہ سے 5 فروری 1924 کو ان کی رہائی عمل میں آئی۔ ادھر ملک میں فرقہ وارانہ منافرت روز افزوں بڑھتی جارہی تھی۔ بھاگلپور میں زبردست فرقہ وارانہ فساد رونما ہوا، جس سے گاندھی جی بہت ملول اور ناراض تھے۔ انہوں نے احتجاج میں برت شروع کر دیا۔ ان کی گرتی صحت کو دیکھ کر دونوں فرقوں نے آپسی خیر سگالی قائم رکھنے کی انہیں یقین دہائی کرائی تب جا کر انہوں نے اپنا برت ختم کیا۔ 22 جنوری 1925ء کو دلی میں گاندھی جی کے زیر صدارت ایک کل جماعتی کانگریس کانفرنس منعقد ہوئی۔ 40 سرکردہ شخصیتوں پر مشتمل ایک ذیلی کمیٹی تشکیل دی گئی جس کا نصب العین آپسی خیر سگالی، اتحاد اور امن کی فضا قائم رکھنا تھا۔ جس میں شاہ زبیر کا بھی بڑا عمل دخل رہا۔ اسی سال (1925ء) گاندھی جی نے ملک گیر دورہ کا پروگرام بنایا اور پرولیا صوبائی سیاسی کانفرنس منعقدہ 12 ستمبر میں اپنی شرکت سے بہار دورہ کی شروعات کی۔ کانفرنس کی صدارت شاہ محمد زبیر نے کی۔ کانفرنس کی غیر معمولی کامیابی پر ڈاکٹر راجندر پرساد نے اپنی خودنوشت ''آتم کتھا'' میں لکھا ہے:

''مہاتما گاندھی حصول آزادی کے لیےعوام میں بیداری لانے کے لیے...... بہار آئے ...... اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ بہار صوبائی سیاسی کانفرنس کا سالانہ اجلاس پرولیا میں شاہ محمد زبیر کی صدارت میں ہونے والا تھا۔ وہاں کے لوگوں نے بڑی دلچسپی کے ساتھ اس کی تیاریاں کی تھیں...... پرولیا کانفرنس بہت ہی کامیاب انداز میں ہوئی۔ نتائج کے اعتبار سے بھی بے حد کامیاب رہی۔ مہاتما گاندھی بمبئی سے کانفرنس میں شرکت کے لیے وہاں پہنچے''۔

(صفحہ 84-83 بحوالہ آتم کتھا ص:241)

شاہ محمد زبیر نے اپنے طویل تحریری خطبہ صدارت میں اس وقت ہندوستان کی موجودہ صورتحال اور اندیشہ ہائے دور دراز سمیت مختلف مسائل وامور پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو کو درپیش ممکنہ دشواریوں پر بھی کھل کر اظہارِ خیال کیا تھا۔ انہوں نے 95 سال قبل اردو کے لیے جو مطالبہ اور ہندوستان میں اس کے تعلق سے جن شکوک وشبہات اور اندیشوں کا اظہار کیا تھا وہ حقیقت حال کو آئینہ دکھاتا ہے۔ صدارتی خطبے کا وہ تاریخی اقتباس ملاحظہ ہو:

''ایک اور مسئلہ ہے جو اس صوبے کے عوام کے ذہن کو گرمائے ہوئے ہے اور ہر طرح کی غلط فہمیوں کو بڑھاوا دے رہا ہے۔ یہ اس صوبے کی عدالتوں میں اردو کے اختیاری رسم خط بنائے جانے کا مسئلہ ہے۔ اس موضوع پر بہت سے اور بعض اوقات بہت تلخ تنازعے اٹھتے رہے ہیں۔ یہاں میں تفصیلی دلائل میں پڑنا نہیں چاہتا۔ کانگریس نے اپنے دفتری دستاویزات میں اردو رسم خط کو جگہ دے کر رہنمائی کی ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسی کہ ہونی چاہیے، لیکن میں کچھ ایسے کانگریسیوں کی ذہنیت سمجھنے سے قاصر ہوں جو یا تو اس کی مخالفت کرتے ہیں یا پھر وہ اُردو داں عوام کے مطالبے کی حمایت نہیں کرتے۔ میں ان لوگوں سے مخلصانہ اپیل کرتا ہوں جو اُردو داں عوام کے مطالبے کی حمایت نہیں کرتے۔ میں ان لوگوں سے مخلصانہ اپیل کرتا ہوں جو اس کی مخالفت کررہے ہیں کہ وہ اسے فرقہ وارانہ مسئلہ نہ بنائیں۔ میں نے اس مسئلہ پر بہت دماغ سوزی کی ہے۔ میں اس ٹھوس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اردو رسم خط اس صوبہ کے اردو داں عوام کے لیے اختیاری حیثیت سے تسلیم کی جائے، لیکن اگر اس معاملہ کو ہم بالائے طاق رکھ دیتے ہیں تو مجھے اندیشہ ہے کہ ہم عوام کے اس فتنہ انگیز طبقہ کے ہاتھوں میں ایک ہتھکنڈا دے دیں گے جو اپنے ذاتی اغراض ومقاصد کے لیے

کانگریس اور اس کے حامیوں اور کارکنوں کے خلاف سرگرم پروپیگنڈا میں مصروف ہیں۔''

(ص:97-96)

کانفرنس کے اختتام کے بعد جب گاندھی جی چھوٹا ناگپور کے دورے پر نکلے تو شاہ صاحب بھی ان کے ساتھ رہے۔

ڈاکٹر راجندر پرساد کے محولہ اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت ہندوستانی سیاست میں شاہ زبیر کو جو مرتبہ ومقام حاصل تھا اس کی نظیر شاذونادر ہی ملتی ہے۔ پرولیا کانفرنس کے موقع پر شاہ زبیر کا صدارتی خطبہ اور کانگریس کے اختتام کے بعد پریس کانفرنس ملک کے مستقبل کا سیاسی، سماجی، ملی ولسانی منشور تھا جو شاہ صاحب کی دور اندیشی، ان کی اعلیٰ ظرفی، وسیع القلبی اور وسیع النظری کا بین ثبوت ہے۔ تاریخ کے صفحات میں گم وہ تاریخی خطبہ بیتاب صدیقی کی کتاب 'معمارِ قوم شاہ محمد زبیر' کے صفحہ 85 تا 121 ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ اس خطبے میں انہوں نے ملک کی تعمیر نو کے لیے جو ٹھوس لائحہ عمل اور اپنے بلند عزائم الگ الگ عناوین کے ساتھ پیش کیے ہیں آج بھی ان کا مطالعہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔

کونسل آف اسٹیٹ کی رکنیت اور استعفیٰ:

پرولیا کی تاریخی کانفرنس کے چند ماہ بعد 1926 کے آغاز میں کونسل آف اسٹیٹ کا انتخاب عمل میں آیا۔ جس میں اڑیسہ اور بہار ملا کر کل چار نشستیں تھیں۔ ان میں ایک سیٹ مسلم امیدوار کے لیے مخصوص تھی۔ ان چار کامیاب امیدواروں میں ایک شاہ محمد زبیر بھی تھے اور وہ کونسل آف اسٹیٹ میں 'سوراج پارٹی' کے سکریٹری بھی منتخب ہوئے تھے۔ انتخاب کے ٹھیک تین برسوں بعد کانگریس نے ملک بھر میں تحریک آزادی کی رفتار کو تیز کرنے کا لائحہ عمل تیار کیا۔ چنانچہ 31 دسمبر 1929ء کی شب تک کلکتہ میں سرکار کو دیئے گئے الٹی میٹم کی مدت جب ختم ہوگئی تو 26 جنوری 1930ء کو پرجوش مجاہدین آزادی نے سرکار کی ناک کے نیچے ملک کا جھنڈا لہرا کر اپنے عزائم اور منصوبوں سے حکومت کو آگاہ کردیا۔ پورے ملک میں آزادی کا حلف لیا گیا اور اس کے لیے تحریک عدم تعاون کا دوسرا دور 26 جنوری 1930ء سے تا آنکہ صبح آزادی شروع ہوئی، گاندھی جی نے چمپارن مارچ میں نمک قانون شکنی کے ذریعے اس کی راہ بھی کھول دی تھی اور اس جانب رہنمائی بھی کردی تھی۔ چنانچہ ملک بھر کے کانگریسی اراکین اسمبلی وکونسل اور مجالس مقنّنہ کے دوسرے اراکین بھی اپنی رکنیت سے مستعفی ہونے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ کونسل آف اسٹیٹ سے سب سے پہلے استعفیٰ دینے والوں میں شاہ محمد زبیر تھے۔

جب تک وہ اس عہدے پر رہے ان کا قیام دریا گنج دہلی کے اس مکان میں رہا جہاں رفیع احمد قدوائی، تصدق حسین خاں شیروانی، مولانا محمد شفیع داؤدی وغیرہ رہتے تھے۔ قیام دہلی کے دوران موتی لال نہرو سمیت دیگر ممتاز سیاست داں وعلمائے کرام کے علاوہ متعدد دانشوران سے ان کے مراسم رہے۔ اسٹیٹ کونسل سے مستعفی ہونے کے بعد ان میں زیادہ تر شخصیتوں کا بہار آنا جانا لگا رہا۔ بہار واپسی کے بعد شاہ صاحب پھر اپنے معمولات میں مصروف ہوگئے اور ہر آڑے وقتوں میں بڑھ چڑھ کر اپنا قائدانہ رول ادا کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جب ملک میں زبان کا مسئلہ کھڑا ہوا تو وہ آسان اردو کی حمایت میں ایک زبردست مجاہد بن کر سامنے آئے۔ واضح ہو کہ 14 مارچ 1927ء کو وہ کونسل آف اسٹیٹ کے مباحثہ کے دوران زبان کے معاملے میں اپنا موقف واضح کر چکے تھے۔ جو کونسل آف اسٹیٹ مباحثہ کی کاروائی جلد نمبر 1، 18 فروری تا 29 مارچ 1927ء صفحہ 3 پر درج ہے۔ زبان کے علاوہ اطفال شادی مخالف بل میں بھی ان کا موقف واضح تھا۔ ملک کے آئین سازی کے لیے آل پارٹی کانفرنس نے پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک ڈرافٹنگ کمیٹی تشکیل دی تھی جس کی تجاویز 'نہرو رپورٹ' کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس رپورٹ کی زبردست مخالفت ہوئی اور بڑے بڑے کانگریسیوں نے اسی اختلاف کی بنیاد پر پارٹی سے علاحدگی اختیار کرلی مگر شاہ صاحب ان چند لوگوں میں تھے جو رپورٹ کی حمایت میں سینہ سپر رہے۔ چنانچہ لکھنؤ کی آل پارٹی کانفرنس 28/29 مئی 1928ء کو چند ترمیمات کے ساتھ اسے منظور کرلیا گیا۔ اس رپورٹ پر انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ میں جو میٹنگ بلائی گئی تھی اس میں شاہ زبیر نے اس کی حمایت میں مجمع سے خطاب کیا تھا، جب کہ اسی جگہ سے ان کے بھائی شاہ محمد عمیر نے رپورٹ کی مخالفت میں اپنی تقریر کی تھی۔ آخر کار ملک بھر میں مخالفت کو دیکھتے ہوئے 'نہرو رپورٹ' کو واپس لے لیا گیا۔ اگر چہ اس رپورٹ نے ملک میں کئی تنازعات کو جنم دیا اور ردعمل کے طور پر بڑے بڑے مسلم رہنماؤں نے نہ صرف اس کی مخالفت کی بلکہ انہوں نے کانگریس سے علاحدگی اختیار کرلی۔ جب کہ شاہ زبیر کے ساتھ مولانا ظفر علی خان ایڈیٹر 'زمیندار' لاہور اس کی حمایت میں ڈٹے رہے اور انہوں نے یہاں تک کہا کہ: ''میں نہرو رپورٹ منوا کر چھوڑوں گا''۔ لیکن آپسی اختلافات کی وجہ کر ایسا نہیں ہو سکا۔

سول نافرمانی کا دوسرا دور:

سول نافرمانی تحریک کے دوسرے دور میں شاہ زبیر نے مونگیر ضلع سے پہلے مرحلے میں ساڑھے چھ سو تحریک کاروں کی ایک فہرست شری کرشن سنہا کے معرفت صداقت آشرم پٹنہ کے سپرد کیا۔ بعد میں یہ

تعداد بڑھ کر تقریباً ایک ہزار تک جا پہنچی۔ صرف دو ماہ کے اندر جواہر لال نہرو، ڈاکٹر راجندر پرساد، پروفیسر عبدالباری وغیرہ کے ساتھ مل کر شاہ زبیر نے ایسی موثر تحریک چھیڑی کہ گرفتاریوں کا سیلاب امنڈ آیا۔ 23 اپریل 1930ء کو بڑھیا میں نمک قانون توڑا گیا۔ جس کی قیادت خود شاہ صاحب نے کی۔ اپنی گرتی صحت کے باوجود انہوں نے اسے پورے بہار میں کامیاب بنانے کے لیے جی جان لڑا دی۔ جس میں مردوں کے شانہ بشانہ خواتین بھی اچھی خاصی تعداد میں پیش پیش تھیں۔ مونگیر ضلع کی سربراہی شاہ زبیر کی اہلیہ کر رہی تھیں۔ اس موقع پر انہوں نے گھر سے باہر نکل کر 25 جولائی 1930ء کو ایک بڑے مجمع عام سے خطاب کر کے اور لوگوں میں جوش وخروش پیدا کیا۔ بدیسی کپڑوں اور سامانوں کے مقاطعہ کرنے والی خواتین کی قیادت پہلے ہی سے وہ کر رہی تھیں۔

جب پورے ملک میں حکومت کا ناطقہ بند ہونے لگا اور پے در پے حملے شروع ہوگئے، تحریک میں مردوں کے ساتھ خواتین بھی میدان میں کود پڑیں تو حکومت برطانیہ خود کو بے بس محسوس کرنے لگی۔ چنانچہ لندن میں ایک راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کا انعقاد 12 نومبر 1930ء کو ہوا جس میں شرکت کے لیے شاہ محمد زبیر کو بھی مدعو کیا گیا۔ مگر انہوں نے اپنی خرابی صحت کی وجہ سے اپنی جگہ پر مولانا شفیع داؤدی کے نام کی پیشکش کر دی۔ اپنی علالت کے سبب شاہ صاحب کانفرنس کے انعقاد سے کوئی دو ماہ قبل 14 ستمبر 1930ء کو رحلت کر گئے۔ دوسرے دن نماز جنازہ حضرت مولانا شاہ لطف اللہ رحمانی سجادہ نشیں خانقاہ رحمانیہ مونگیر نے پڑھائی۔ افسوس کہ اس وقت ان کے بھائی شاہ محمد زہیر ہزاری باغ جیل میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے، جس کی وجہ سے وہ جنازے میں شامل نہیں ہو سکے۔ شاہ محمد زبیر چار بھائی اور تین بہن تھے۔ باری باری سے ان سبھوں کا انتقال ہوگیا۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ بی بی صدیقہ کے علاوہ تین لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔ بڑے لڑکے شاہ مشتاق احمد ان کے سیاسی جانشین ہوئے۔ ان کے پوتا شاہ طارق انور بھی اپنی طالب علمی سے لے کر اب تک سرگرم سیاست میں اپنی اہمیت کے ساتھ ہیں اور اس حیثیت سے ان کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ شاہ محمد زبیر کے انتقال کے پانچ ماہ بعد ان کی اہلیہ بھی دارِ فانی سے کوچ کر گئیں۔ شاہ محمد زبیر کی رحلت سے ملک وملت ایک بلند پایہ قائد، فیض رساں انسان، بے خوف مجاہد آزادی، حب الوطنی کے جذبات سے سرشار، ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار، پر جوش خطیب، بے پناہ انتظامی صلاحیتوں کا حامل، مدبر، حوصلہ منداور دردمند انسان اور معمارِ قوم سے محروم ہوگیا۔ ع

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

گاندھی جی نے شاہ محمد زبیر کی وفات کو اپنا ذاتی نقصان بتاتے ہوئے انہیں پرخلوص خراج عقیدت پیش کیا، جب کہ ڈاکٹر راجندر پرساد صدر کانگریس کی حیثیت سے پہلی بار مونگیر تشریف لائے اور مونگیر ڈسٹرکٹ بورڈ میں شاہ زبیر کی آویزاں تصویر کی نقاب کشائی کرتے ہوئے ان کی قائدانہ صلاحیت اور سیاسی بصیرت کا اعتراف کیا۔ موتی لال نہرو نے شاہ محمد زبیر کی رحلت کو اپنے لیے انتہائی صدمے کا باعث قرار دیا۔ حکیم شاہ بلال مشہدی وارثی گیاوی نے قطعہ تاریخ رحلت برآمد کی:

برآمد آہ ز قلب حزیں چوں گفت کسے — حیاتِ حضرت شاہ زبیر آخر شد
زمان گردش آں کوکب درخشندہ — میان قبۂ ایں کہنہ دیر آخر شد
بہ اصل گرد رجوع و بہ نور حق پیوست — بہ رفت برست از تگ دنیا وسیر آخر شد
گمان نہ بود کہ ایں است صحبت آخر — ہمیں کہ کرد وداع او بہ خیر آخر شد

ز روئے سال مسیحی بگفت بلبل زار
بہار شاہ محمد زبیر آخر شد
1930ء

بیتاب صدیقی: ایک اجمالی جائزہ

بہار میں اردو تحریک کی داغ بیل جن باکمال ہستیوں نے ڈالی، جنھوں نے اسے اپنے خونِ جگر سے سینچا اور اپنی عمر عزیز کا بہترین حصہ اس کے لیے وقف کر دیا ان میں ایک اہم نام مولانا عبدالحئی بیتاب صدیقی فاضل شمسی (گولڈ مڈلسٹ) کا بھی ہے، جن کے ذکر کے بغیر اردو تحریک کی کوئی بھی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔

میانہ قد، گندمی رنگ جو اردو کی دھوپ میں تپ کر اور بھی گہرا ہو گیا تھا، دور سے نظر آنے والی داڑھی، شرعی مونچھ، عام سا چہرہ بشرہ، آگے کی جانب نکلے ہوئے قدرے سفید چمکیلے دانت، قدیم شرفاء کا لباس، شیروانی، پاجامہ اور ٹوپی۔ عمل کی حرارت سے بھرپور ٹھنڈا مزاج۔ جس عمر میں لوگ تھک کر بیٹھ جاتے ہیں بیتاب صدیقی دوڑ رہے تھے اور ان کے رفقاء تیز تیز قدموں سے ان کے ساتھ چل رہے تھے۔ تحریک میں روزِ اوّل سے ان کے ساتھ جو آیا یا جن کے ساتھ وہ ہوئے آخر دم تک ان کا ساتھ رہا۔ اردو بیتاب صدیقی کی جان تھی، زندگی اور موت تھی، غیرت وحمیت تھی، وہ اسی کے لیے جیتے رہے اور اسی کو اپنے ساتھ لیے مر گئے۔ بظاہر نحیف ونزار، مرنجان مرنج اور غیر جاذب شخصیت کے مالک بیتاب صدیقی نے قومی، ملی، سیاسی، ادبی، صحافتی اور لسانی محاذ پر جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ بہار کی تاریخ کا ایسا روشن باب ہے جس سے آج بھی اکتساب کیا جارہا ہے۔ ایک عام آدمی کی طرح ضعیفی، گھریلو مصروفیات اور بیماریاں ان کی راہ میں بھی حائل ہوئیں لیکن وہ ان کے عزائم سے شکست کھاتی رہیں۔ اردو کی سنگلاخ وادیوں اور پرخار راہوں کی آبلہ پائی کرتے ہوئے انہیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ وہ ایک زمیندار دادا کے پوتے، ہیرے جواہرات کے تاجر کے بیٹے ہی نہیں اپنی ذی حیثیت پھوپھی کے وہ بھانجا ہیں جس نے چھ ماہ کی عمر سے ہی انہیں بڑے لاڈ پیار اور ناز نخرے کے ساتھ پرورش کی اور انہیں گود لے لیا۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے اپنی تمام جائداد بھی ان کے نام کر دی۔ لیکن ستم ظریفی یہ کہ ہم ان کے متعلق یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ اپنی طالب علمی کے دور سے ہی مختلف محاذ پر انتہائی متحرک اور فعال تھے، ہم نہیں جانتے کہ خلافت تحریک میں بھی وہ سرگرم

عمل اور ایک محبّ وطن کی حیثیت سے تحریک آزادی میں پیش پیش تھے، ہم نہیں جانتے کہ پٹنہ میں مہندرو کے پاس سرنگ کھودتے ہوئے جب انگریزی فوج کے سپاہی نے ان کے سر پر اپنی بندوق رکھ دی تو بھی وہ اپنے کام میں مصروف رہے۔ وہ حق کی آواز بلند کرنے کی پاداش میں غلام ہندوستان میں بھی جیل گئے اور آزاد بھارت میں بھی قید و بند کی صعوبتیں اٹھائیں۔ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ انہیں جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسی شخصیتوں کی صحبت بھی حاصل رہی اور سید محمود، شاہ محمد زبیر اور عبدالقیوم انصاری جیسے قائدین سے قربت بھی۔ اپنے اسلاف کے انہیں کارناموں سے واقفیت، ان کی دریافت و بازیافت اور تحفظ ہمارا فرضِ منصبی ہے، تاکہ ان کی روشنی میں ہمیں اپنا تہذیبی، تاریخی، علمی و ادبی سفر جاری رکھنے اور ''نام نیک رفتگاں ضائع مکن'' پر عمل پیرا ہونے کی سعادت بھی حاصل ہو سکے۔ اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی بیتاب صدیقی تھے۔ جن پر اردو تحریک ہمیشہ ناز کرتی رہے گی۔

بیتاب صدیقی سات آٹھ سال کی عمر میں گھر کے تمام آرام و آسائش کو چھوڑ کر حصولِ علم کے لیے بھاگے، جو ان کا پہلا اجتہادی بلکہ انقلابی قدم تھا۔ رفتہ رفتہ یہی انہیں کامیابیوں کی آخری منزل تک لے گیا۔ مختلف مدرسوں میں پڑھتے ہوئے ہمیشہ حق کے لیے سینہ سپر رہے اور اس کے لیے انہیں ابتلا و آزمائش کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ لیکن انہوں نے اپنی نوجوانی سے لے کر پیری تک ایک ایک لمحے کو سیاسی، تحریکی، اصلاحی اور فلاحی کاموں کے ساتھ درس و تدریس کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ وہ بہار کی اردو تحریک کے ایک اہم ستون ہوتے ہوئے یہاں کے مختلف تعلیمی و انتظامی عہدوں پر فائز رہے اور سبھوں میں اپنی بہترین خدمات انجام دیں۔ شعر و ادب اور صحافت کے ساتھ مدرسہ ایجوکیشن اور سرکاری و نجی اسکولوں کے ثانوی درجہ تک اردو اور فارسی نصاب کے علاوہ علاقائی زبانوں میں درسیات کی بہتری اور ان کی تحریر و تصنیف اور تراجم کے شعبے میں بھی ان کی کارگزاریاں نمایاں ہیں۔

بیتاب صدیقی کے بچپن سے مدرسے کی تعلیمی زندگی اور پھر 24-1923ء سے 1998ء تک کے غیر معمولی کارناموں کو اس فردنامے کے توسط سے متعارف کرانے کی یہ پہلی کوشش اور خراج عقیدت ہے ورنہ
ع کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے۔

حوالے

(۱) ہفتہ وار 'طوفان'، پٹنہ۔ ایڈیٹر بیتاب صدیقی
(۲) ہفتہ وار 'مومن دنیا'، پٹنہ۔ عبدالحئی صدیقی
(۳) ہفتہ وار 'سنگم'، پٹنہ۔ ایڈیٹر غلام سرور
(۴) روزنامہ 'سنگم'، پٹنہ۔ غلام سرور (1949ء سے مختلف شمارے)
(۵) اردو دوستوں سے دو دو باتیں۔ سید احسان اشرف۔ 1973ء
(۶) سکریٹری رپورٹ۔ بیتاب صدیقی 1975ء
(۷) 'زبان و ادب'، پٹنہ۔ جنوری-اپریل 1981ء
(۸) 'مقالاتِ غلام سرور'۔ یونس ہرگانوی۔ 1983ء
(۹) 'الشمس'، پٹنہ۔ 1988ء
(۱۰) 'معمارِ قوم شاہ محمد زبیر'۔ بیتاب صدیقی۔ 1990ء
(۱۱) 'حیاتِ بیتاب'۔ روزنامہ 'سنگم'، پٹنہ 1996ء سے 1997ء تک
(۱۲) سہ ماہی 'ندائے پاسدار'، پٹنہ۔ شاہ مشتاق نمبر، ایڈیٹر اسلم جاوداں 2007ء
(۱۳) 'تلاش و تصنیف'، نسیم اختر 2013ء
(۱۴) 'باتیں' نسیم اختر 2014ء
(۱۵) نیشنل کانگریس سیشن اینڈ اٹس پریسیڈنٹ، نئی دہلی آرکائیو

ختم شد